80 Abasa Makky Verses 42

سورۂ عبس

مکۂ مکرمہ میں نازل ہوا اس میں بیالیس ۴۲ آیتیں ہیں

سورت شریفہ کی فضیلت اس سورت شریفہ کو سورۂ صاخۃ اور سورۂ سفرہ اور اور سورۂ اعمیٰ بھی کہتے ہیں۔ اس اعتبار سے کہ اس میں ان کا بیان آرہا ہے۔ اور سورۂ عبس اس وجہ سے اس کا نام ہوا کہ اس کا آغاز اسی کلمہ شریفہ سے ہوا ہے۔ بہرحال کسی سورت کے ایک سے زیادہ نام ہونا اس کی فضیلت اور شرف کی دلیل ہے۔

کتاب اللہ پر زیادتی از خود جائز نہیں حضرت انس رض فرماتے ہیں:۔ استأذن العلاء بن یزید الحضرمی علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فاذن له فتحدثنا طویلا ثم قال یا علاء تحسن من القرآن شیئا قال نعم ثم قرأ علیه عبس حتی ختمها فانتهی الی آخرها وزاد فی آخرها من عنده وھو الذی اخرج من الحبلیٰ نسمة تسعیٰ من بین شراسیف وحشا فصاح به النبی صلی اللہ علیہ وسلم یا علاء انته فقد انتهت السورة۔ (ابن النجار) ایک دفعہ علاء بن یزید حضرمی نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے

حاضر خدمت ہونے کی اجازت چاہی آپ نے اجازت دی۔ دیر تک بات چیت ہوتی رہی پھر حضور نے فرمایا " اے علاء! تم کچھ قرآن بھی اچھی طرح پڑھ سکتے ہو۔ انھوں نے کہا ہاں۔ پھر انھوں نے سورۂ عبس کی تلاوت شروع کی تا آنکہ سورہ ختم کر دیا۔ اور آخر میں اپنی طرف سے یہ اضافہ کرنے لگے :۔ وھو الذی اخرج من الحبلی النسمۃ تسعیٰ من بین شراسیف وحشی۔ اور وہ خدا ہی ہے جس نے حاملہ عورت سے روح رواں پیدا کی پیٹ کے سامان (دل، جگر، پھیپھڑوں وغیرہ) کے درمیان سے"۔ یہ سنتے ہی حضور نے ان کو فوراً ڈانٹ دیا کہ بس بس۔ سورہ ختم ہو چکا"۔ اس سے معلوم ہوا کہ کتاب اللہ کے ساتھ اپنی طرف سے کسی قسم کا اضافہ و زیادتی جائز نہیں۔

سورت ماقبل سے ربط اس سورت شریفہ کا ربط اور مناسبت سورۂ ماقبل سے اس طرح ہے کہ سابقہ سورت کے آخری حصہ میں ارشاد ہوا تھا :۔ انما انت منذر من یخشاھا۔ آپ صرف ڈرسانے والے ہیں ان کو جو ساعت قیامت کی ہیبت رکھتے ہیں "۔ اور یہاں ان لوگوں کا بیان آرہا ہے کہ آپ کے انذار یعنی ڈرسانے سے کن کو فائدہ پہنچ سکتا ہے اور کن کو نہیں۔ گویا انذار کا نتیجہ یہاں بیان فرمایا جا رہا ہے اور سابقہ سورت اس کی تمہید تھی ۔

واللہ اعلم۔

(۸۰)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے"

عَبَسَ وَتَوَلّٰیٓ ۝ اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰی ۝ ترش رو ہوئے اور منہ

پھیر لیا اس پر کہ آیا اُن کے پاس وہ نابینا"

شانِ نزول ایک دفعہ تاجدارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت مبارک میں عتبہ بن ربیعہ، شیبہ بن ربیعہ۔ ابوجہل، عباس بن عبدالمطلب، امیہ بن خلف، ولید بن مغیرہ صنادید قریش حاضر تھے۔ آپ اس موقع کو غنیمت جان کر بطور خاص انکو اسلام کی دعوت دینے لگے، اس توقع پر کہ اگر یہ لوگ مسلمان ہو جائیں تو ان کے زیرِ اثر جو لوگ ہیں وہ بھی مسلمان ہو جائیں گے اور فریضۂ تبلیغ بہت آسانی سے ادا ہوگا۔ کیونکہ قریش کے تمام قبیلہ پر ان کو خوب اثر اور رسوخ حاصل تھا۔ اتنے میں عبداللہ بن ام مکتوم نابینا جو سابقین اسلام سے تھے یہ بھی حاضر ہو گئے۔ اور آتے ہی کمال بے تکلفی سے عرض کرنے لگے: ۔ یا رسول اللہ اقرئنی وعلّمنی ممّا علّمک اللہ تعالیٰ۔ اللہ کے پیارے رسول! اللہ تعالیٰ نے آپ کو جو کچھ تعلیم دی ہے اس میں سے مجھے بھی کچھ پڑھایئے سکھایئے"۔ آپ نے ان کی اس بے موقع فرمائش کو کسی اور وقت کے لئے ٹالنا چاہا مگر وہ اصرار کرنے لگے۔ یہ بیچارے نابینا تھے

ان کو کیا معلوم کہ حضور اکرمؐ کس مہم میں مشغول ہیں۔ اور کون آپ کے ہاں بیٹھے ہوئے ہیں۔ یہ قریش کے سردار بڑی نخوت والے اتفاق سے جمع ہیں۔ ان کو بڑی حکمت سے مائل بہ اسلام کیا جا رہا ہے۔ اگر نابینا کی طرف التفات کیا جائے تو بیشتر سے جو سعی بلیغ ہو رہی ہے وہ سارا نظم درہم برہم ہو جائیگا یہ دنیادار ایسی ظاہری گری ہوئی حالت والوں کے ساتھ بیٹھنا تک گوارا نہیں کرتے اگر ان کو چھوڑ کر ادھر متوجہ ہوں تو مبادا وہاں سے وہ اٹھ کر چلے جائیں اور پھر کبھی ادھر کا رخ نہ کریں اور یہ لوگوں میں چرچا کرنے لگیں کہ ایسے معمولی لوگ جہاں جمع رہتے ہیں ان کے پاس کیا جائیں؛ چنانچہ حضرت مجاہد فرماتے ہیں: — کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم مستخلیا بصندید من صنادید قریش وھو یدعوہ الی اللہ وھو یرجو ان یسلم اذ اقبل عبد اللہ بن ام مکتوم الاعمی فلما راہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم کرہ مجیئہ وقال فی نفسہ یقول ھذا القرشی انما اتباعہ العمیان والسفلۃ والعبید فعبس فنزل الوحی عبس وتولی (عبد بن حمید) حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رؤسائے قریش میں سے ایک رئیس کے ساتھ تخلیہ فرما رہے تھے اور آپ اس کو اللہ سبحانہ کی طرف دعوت دے رہے تھے اور آپ پُر امید تھے کہ وہ مسلمان ہو جائے گا اتنے میں عبد اللہ بن ام مکتوم نابینا آنے لگے جب

آپ نے ان کو آتے ہوئے دیکھا تو ان کی یہ آمد آپ کو ناگوار سی ہوئی اور دل میں یہ خیال فرمانے لگے کہ یہ قریشی کیا کہیگا کہ ان کے تبعین تو صرف ایسے اندھے، کمینے اور غلام ہیں۔ اس بنا پر کچھ تیوری چڑھ گئی۔ ساتھ ہی وحی آئی اور عبس وتولی وغیرہ آیات کریمہ نازل ہوئیں۔" الغرض ان تصورات کی بنا پر آپ کو سخت تشویش اور تردد لاحق رہا اور اسی سلسلہ میں صنادید قریش سے قطع کلامی ناگوار خاطر ہوئی، تیوری چڑھ گئی اور نابینا کی طرف التفات نہ فرمایا۔ اس پر یہ آیات کریمہ نازل ہوئیں :—

عَبَسَ وَتَوَلّٰٓى اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى ۔ ترش رو ہوئے یا تیوری چڑھائی اور منہ پھیر لیا اس اندھے کے آنے پر۔"

طلبہ علوم عربیہ سے خطاب رب العزت جل جلالہ وعم نوالہ کی طرف سے اگرچہ بظاہر یہ صورت عتاب معلوم ہو رہی ہے لیکن اس میں بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پاس خاطر حد درجہ ملحوظ رکھا گیا اور عتاب کا بھی ایسا لطیف پیرایہ اختیار فرمایا گیا کہ اس سے بہتر لطف آمیز طرز کلام متصور نہیں ہو سکتا وہ اس طرح کہ اس کا آغاز غائب کے صیغوں اور غائب کی ضمیر سے فرمایا کہ خاطر اقدس پر گراں نہ گزرے۔ عَبَسَ اور تَوَلّٰٓى دونوں غائب کے صیغے ہیں اور جَآءَهٗ میں ضمیر "ہ" بھی ضمیر غائب لائی گئی۔ گویا دوسری طرف دیکھ کر کلام فرمایا جا رہا ہے۔ پھر اس طرح غائبانہ طرز سے سلسلہ کلام

آغاز کرنے کے بعد جس سے معلوم نہ ہو سکے کہ یہ کلام کن سے ہے اور یہ ارشاد کس سے ہو رہا ہے۔ وہلۂ ثانیہ میں مخاطب فرمایا جا رہا ہے۔ اور بعد کے صیغے خطاب کے اور ضمیریں بھی خطاب کی وارد ہوئی ہیں تا یہ معلوم نہ ہو کہ آپ سے اس سلسلہ میں اللہ سبحانہ نے بالکل اعراض ہی فرما لیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہو رہا ہے:—

وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّهُ يَزَّكَّىٰٓ ۙ أَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنفَعَهُ الذِّكْرَىٰٓ ۝

اور کیا معلوم آپ کو کہ شاید وہی پاک ہو جاتا' یا نصیحت مانتا پھر فائدہ دیتی اسکو نصیحت۔"

انجام کیا ہوگا کسی کو خبر نہیں

یعنی آپ تو یہ آس لگائے ہوئے ہیں اور توقع رکھتے ہیں کہ صنادید قریش کی جماعت' آپ کی تبلیغ و ارشاد کی بدولت' اصلاح پذیر ہو جائے یا آپ کی نصیحت سے کم از کم ان کو کچھ نفع پہنچ جائے مگر حقیقت حال اور مآل کار کیا ہوگا اور علم الٰہی میں کیا ہے اس کی آپ کو کیا خبر؟ ہو سکتا ہے کہ یہی نابینا اپنے نفس کا بالکلیہ تزکیہ کر کے یا آپ اس کو نصیحت فرمائیں تو کم از کم آپ کی نصیحت مان لے اور اس سے اس کو کچھ فائدہ پہنچ جائے۔ بہر حال آپ کی نصیحت اور فیضان کا فائدہ کلی یا جزوی کس کو پہنچنے والا ہے' یہ آپ کے علم میں کہاں سے آسکتا ہے جب تک کہ ہم اس کی خبر آپ کو نہ دیں۔ لہذا نتیجہ معلوم ہونے سے پیشتر نابینا کی آمد سے ترش روئی

اور عدم التفات یا ایک نابینا مسلمان پر جماعت کفار کو ترجیح خواہ اس جماعت سے کیسی ہی دینی توقعات ہوں ہیچ اور ناقابل التفات ہے چنانچہ اسکی مزید توضیح آگے کی آیات کریمہ میں فرمائی جارہی ہے:۔

اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰی ۙ فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰی ؕ وَمَا عَلَیْكَ اَلَّا یَزَّكّٰی ؕ وہ جو پرواہ نہیں کرتا، آپ اس کی طرف توجہ کرتے ہیں، حالانکہ آپ پر کچھ ذمہ داری نہیں اس کی جو وہ پاک نہ ہو“

بے پرواہ ناقابل التفات ہے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:۔ استغنی عن اللہ وعن الایمان بما لہ من المال۔ (مظہری) یعنی جو بے پرواہ ہے اللہ سے اور اس پر ایمان لانے سے اپنے مال کے گھمنڈ پر۔ چنانچہ جو کفار دولتمند تھے وہ برملا کہا کرتے تھے کہ اگر کوئی آفت ہم پر آئیگی تو اپنی دولت خرچ کرکے اس آئی ہوئی آفت کو ہم ٹال دیں گے اور اسی گھمنڈ کی بنا پر اللہ سبحانہ کا کوئی خوف ان کو نہ تھا۔ نہ وہ اللہ پر ایمان لاتے تھے اس لئے ارشاد ہو رہا ہے کہ اے نبی کریم! آپ ایسے لوگوں کی طرف التفات فرماتے ہیں جو نڈر واقع ہوئے ہیں اس امید پر کہ ان کا تزکیۂ قلب ہو جائے گا۔ اگر ان کے قلوب پاک نہ ہوئے تو آپ پر اس کی کوئی ذمہ داری نہیں اور نہ کوئی الزام آپ پر عائد ہو سکتا ہے اس لئے کہ آپ کا فریضہ صرف اس حد تک ہے کہ اللہ سبحانہ کا پیام ان تک۔

(۸۰ عبس آیت ۵ تا ۷)

پہنچادیں۔ اس کو قبول کرنا یا نہ کرنا ان کا کام ہے اگر وہ آپ کی ہدایت کو نہ مانیں تو الزام ان پر ہے آپ پر نہیں۔ پھر آپ کو ان کی ایسی خاطرداری کی کیا ضرورت ہے؟ چنانچہ قرآن کریم میں بار بار یہ ارشاد ہوا ہے:۔ انما علیك البلاغ۔ آپ پر صرف احکام الٰہی کو اُن تک پہنچادینا ہے اور بس" ان کا تزکیہ آپ پر واجب نہیں۔

وَاَمَّا مَنۡ جَآءَكَ يَسۡعٰىۙ ۝ وَهُوَ يَخۡشٰىۙ ۝ فَاَنۡتَ عَنۡهُ تَلَهّٰى ۝

اور وہ جو آیا آپ پاس دوڑتا ہوا اور وہ ڈرتا ہے تو آپ اس سے تغافل فرماتے ہیں"

اہل خشیت کی طرف التفات رہا وہ جو کمال رغبت اور شوق سے آپ کے ہاں دوڑے دوڑے آرہا ہے۔ اور وہ اللہ سبحانہ کا علم و عرفان رکھتا ہے اور جس کی بدولت وہ اللہ سے ڈرتا ہے تو آپ اس سے تغافل برت رہے ہیں اور اسکی طرف التفات نہیں فرماتے (ایسا نہ ہونا چاہیئے) بلکہ آپ کی نظر التفات کا زیادہ تر مستحق یہی آخر الذکر ہے آپ کی ہدایات کے قدرداں ایسا ہی شوق و رغبت اور خوف و خشیت رکھنے والے ہیں۔ اگرچہ یہ نابینا چشم بصارت نہیں رکھتے لیکن چشم بصیرت سے بہرہ ور ہیں گو دنیوی مال و دولت ان کے پاس نہیں ہے مگر خدا و رسول کی عظمت و احترام سے مالا مال ہیں۔ رہے کفار وہ آپ کی ہدایات و تعلیمات کی قدر

کیا جائیں جن کی چشم بصیرت اندھی ہے اور جن کے قلوب تاریک۔ صرف دو روزہ دنیا کی دولت پر اترا رہے ہیں۔ ایسے چند شیخی باز آپ کی خدمت میں حاضر ہوں تو کیا اور جو نہ آئیں تو اس میں آپ کا کیا نقصان؟ اگر اہل خشیت سے توجہ ہٹا کر ایسے مغروروں متکبروں کو بار بار کیا جائے تو اس سے فریضۂ تبلیغ کی افادیت متاثر ہو گی۔ دشمنان اسلام کو موقع مل جائے گا اور یہ چرچا شروع ہو گا کہ آپ کو مال داروں سے محبت ہے اور نادار لوگوں سے نفرت۔ گویا آپ کو مالداروں اور اغنیا سے کچھ حاصل کرنے سے غرض ہے۔ معاذ اللہ۔

ابن ام مکتومؓ کی منقبت عبداللہ ابن ام مکتوم ام المومنین حضرت سیدتنا خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے ماموں زاد بھائی تھے۔ قریشی تھے سابقین اسلام سے تھے۔ کہتے ہیں کہ ایک وقت جو ان کی طرف کچھ بے التفاتی محسوس ہوئی تو وہ نہایت مغموم اور دلگیر ہو کر روتے ہوئے واپس ہوئے کہ مجھ سے کیا خطا ہوئی کہ حضور معدن الجود والکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وہ تلطف نہ پایا جو ہمیشہ پاتا تھا۔ ادھر آپ پر یہ وحی نازل ہوئی۔ امام زاہدؒ فرماتے ہیں کہ ساتھ ہی حضرت رسول مجتبیٰ علیہ الف الف تحیۃ وثناء بھی ان کے پیچھے روانہ ہوئے۔ اور فرط شفقت سے ان کو بلا لائے۔ چادر مبارک ان کے لئے بچھائی اور اس پر ان کو بٹھایا۔ اور بکمال عنایت سے ان کو شرف تکلم بخشا۔ اس کے بعد آپ کی عادت شریف ہی یہ ہو گئی کہ ابن مکتومؓ جب کبھی حاضر ہوتے تو

نہایت ہی عزت واحترام سے ان کے ساتھ پیش آتے اور ان کو آتا ہوا دیکھ کر مسرت سے بے ساختہ فرماتے۔ مرحباً بمن عاتبنی فیه ربّی۔ آؤ آؤ نزدیک آؤ۔ تم تو وہ ہو جن کی خاطر میرے رب العزت نے مجھ سے عتاب محبت سے خطاب فرمایا۔ صلی اللہ علی طور التجلیات الاحسانیه و مهبط الاسرار الرحمانیه" پھر فرماتے:۔ هل لك من حاجة۔ کیا کوئی اور حاجت ہے؟ یعنی جس مقصد سے وہ آتے اس کی تکمیل کے بعد دریافت فرماتے کہ اور کسی چیز کی ضرورت ہے؟

خلق عظیم کی وسعت

پھر خلق عظیم کی وسعت کا یہ حال تھا کہ ایسی توجہ اور عنایت نہ صرف حضرت ابن ام مکتومؓ پر بلکہ ان جیسے شکستہ حال جو اصحابؓ بھی آتے ان پر بھی ایسی ہی عنایت و شفقت مبذول رہتی۔ اور دوسروں کو چھوڑ کر پہلے ایسے لوگوں کا خیال ملحوظ خاطر ہوتا۔ اور کبھی بھی کسی شکستہ حال کی آمد پر ذرا بھی ناگواری اور ترش روئی دیکھنے میں نہ آئی۔ حضرت حکمؓ فرماتے ہیں:۔ ما رؤی رسول الله صلی الله علیه وسلم بعد هذه الآیة متصدّ یا لغنیّ ولا معرضا عن فقیر۔ (ابن ابی حاتم) اس واقعہ کے بعد سے حضرت سید الانبیاء علیه التحیة والثناء کو کبھی نہیں دیکھا گیا کہ آپ نے کسی دولت مند کو (محض اس کی دولتمندی کی بناء پر) ترجیح دی ہو۔ یا کسی فقیر سے (اسکے فقر و فاقہ کے باعث) کبھی اعراض فرمایا ہو" اور یہ کیونکر ہو سکتا درحالیکہ آپ

عموماً فرمایا کرتے :۔ الفقر فخری ۔ فقر وفاقہ تو ہمارے لئے موجب افتخار ہے اور طرۂ امتیاز ۔" مسند نشینان شریعت غراء (علماء ومشائخ طریقت وا ہتداد کا طرز خطاب بھی ایسے اصحاب کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیئے اور ان کو اس اسوۂ حسنہ کا اتباع لازم جاننا چاہیئے ۔ حدیث شریف میں آیا ہے :۔ من تحامل علی فقیر لغنی فقد ھدم ثلث دینہ ۔ جس نے کسی غنی کو (اس کے غناء وتونگری کی وجہ سے) کسی فقیر پر (محض اسکے فقر کی بناپر) ترجیح دی تو اس نے اپنے دین کا ایک تہائی حصہ منہدم کر لیا ۔"

ابن مکتوم کی پابندی جماعت حضرت ابو امامہؓ فرماتے ہیں :۔ اقبل ابن ام مکتوم الاعمی وھو الذی نزل فیہ عبس وتولی ان جاءہ الاعمی فقال یارسول اللہ کما تری قد کبرت سنی ورق عظمی وذھب بصری ولی قائد لا یلائمنی قیادہ ایای فھل تجد لی من رخصۃ اصلی الصلوات الخمس فی بیتی قال ھل تسمع المؤذن قال نعم قال ما اجد لک من رخصۃ ۔ (طبرانی ابن مردویہ)

ابن ام مکتومؓ نابینا جن کے بارے میں عبس وتولی ان جاءہ الاعمی وغیرہ آیات کریمہ نازل ہوئیں ایک دفعہ خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور عرض کیا :۔

یارسول اللہ ! آپ مشاہدہ فرماتے ہیں کہ میں سن رسیدہ ہو گیا اور میری ہڈیاں تک پتلی پڑ گئیں اور میری بینائی تو پیشتر ہی جا چکی ہے ۔ میرا ایک خادم ہے جو مجھے لاتا

لیجاتا ہے لیکن اس کی قیادت میرے منشا کے مطابق نہیں ہوا کرتی۔ ایسی حالت میں کیا آپ میرے لئے ایسی سہولت پاتے ہیں کہ پنجگانہ نمازیں میں اپنے گھر ہی میں پڑھ لیا کروں؟ آپ نے دریافت فرمایا کیا تم اذاں کی آواز سنتے ہو؟ جواب دیا ہاں سنتا ہوں۔ تو فرمایا پھر تو میں تمہارے لئے کوئی گنجائش نہیں پاتا۔" یعنی تم کو مسجد میں حاضر ہو کر پانچوں وقت کی نمازیں با جماعت ادا کرنی چاہئیں۔ چنانچہ وہ اس کے بعد پنجوقتہ نمازوں میں پابندی کے ساتھ حاضر ہوا کرتے۔ بلکہ سب سے پہلے آکر اذاں کہا کرتے جیسا کہ ابھی گزرا۔ پھر ان کی ہمت اور بڑھی اور نمایاں خدمات انجام دینے لگے۔ سید الانبیاء علیہ التحیۃ والثناء غزوات میں تشریف لیجاتے تو عموماً مدینہ پر ابن ام مکتومؓ کو اپنا جانشین بناتے۔ ارباب سیر لکھتے ہیں کہ تیرہ دفعہ آپ نے ان کو اپنا جانشیں بنایا۔ یہ آپ کی واپسی تک لوگوں کی امامت کیا کرتے۔ باقی وقتوں میں حضرت بلالؓ کے علاوہ یہ بھی موذنی کی خدمت انجام دیتے۔ رمضان المبارک میں اذان فجر یہ دونوں حضرات یکے بعد دیگرے کہتے تھے مگر حضور اکرمؐ کی تاکید ہوتی کہ بلال رات رہنے پر اذاں کہتے ہیں اس لئے ان کی اذاں پر سحری ختم نہ کرو بلکہ ابن مکتوم کی اذاں پر سحری ختم کیا کرو۔ اتنی محبت وشفقت کے باوجود دین کے معاملہ میں کوئی رعایت ان کے ساتھ نہ تھی۔

ابن مکتوم کی غزوات میں شرکت اور شہادت

حضور سید المرسلین صلوات اللہ علیہ وعلیہم اجمعین کے بعد

ابن ام مکتومؓ نابینا ہونے کے باوجود دور دراز غزوات میں شریک رہتے۔ اور شایانِ شان خدمات انجام دیتے۔ عہد فاروقی میں جب شہر مدائن پر چڑھائی ہوئی تو اس میں ابن مکتوم بھی شریک تھے حضرت انسؓ فرماتے ہیں:۔ ورأیته یومئذ وعلیه درع وله رایة سوداء۔ میں نے مدائن کی جنگ میں ابن مکتوم کو دیکھا کہ وہ زرہ پہنے ہوئے شریک ہیں سیاہ جھنڈا لئے ہوئے" کہتے ہیں کہ قادسیہ کے جنگ میں ان کی شہادت ہوئی۔ اور یہ بھی مروی ہے کہ مدینہ پاک واپس آئے اور یہاں وفات پائی۔ ممکن ہے کہ قادسیہ میں زخمی ہوئے ہوں اور وفات مدینہ طیبہ میں ہوئی ہو۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔

ام المومنین کی شفقت حضرت مسروق کہتے ہیں:۔ دخلت علی عائشہ عنہا رجل ملفوف تقطع له الاترج وتطعمه ایاہ بالعسل فقلت من ھذا یا ام المومنین فقالت ھذا ابن ام مکتوم الذی عاتب اللہ فیه نبیه صلی اللہ علیه وسلم (حاکم بروایت صحیحہ ابن مردویہ، بیہقی) میں ایک دفعہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی خدمت میں حاضر ہوا تو دیکھا کہ ان کے پاس ایک نابینا ہے جس کو آپ ترنج کاٹ کاٹ کر شہد کے ساتھ ملا کر کھلاتی جا رہی ہیں میں نے دریافت کیا۔ ام المومنین! یہ کون ہے؟ تو فرمایا کہ یہ ابن مکتوم ہیں جن کے بارے میں اللہ سبحانہ نے اپنے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر عتاب فرمایا"

ابن زیدؒ کا تاثر حضرت ابن زیدؓ فرماتے ہیں: لو ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم کتم شیئًا من الوحی کتم ھذا عن نفسہ۔ (ابن ابی حاتم) فرض کرو کہ اگر حضرت رسول دو جہاں علیہ صلوات الرحمان وحی الٰہی کا کوئی سا حصہ بھی چھپائے رکھے ہوتے تو ضرور اس واقعہ کو چھپاتے۔" یعنی ابن مکتوم کا واقعہ جس میں آپ پر عتاب ہوا اس کا قرآن کریم میں مذکور ہونا اور اس کا پڑھا جانا معلوم ہے یہ خود اس امر کی کھلی دلیل ہے کہ آپ پر جو جو وحی نازل ہوتی رہی آپ اس کو لکھوا دیتے رہے۔ آپ کے صادق و مصدوق ہونے کی یہ کھلی دلیل ہے کہ تعریف و منقبت اور فضائل کے باب میں جو آیات کریمہ نازل ہوئیں جس طرح ان کو لکھوا دیا ٹھیک اسی طرح اس نوع کی آیات کو بھی آپ نے صاف صاف لکھوا دیا۔ یہی شان صدق و صفا ہے۔ صلی اللّٰہ علی طور التجلیات الاحانیہ۔ ورنہ معاذ اللّٰہ اگر آپ احکام الٰہی کو چھپانے اور لوگوں تک ان کو نہ پہنچانیوالے ہوتے تو قرآن کریم میں اس کا وجود نہ ہوتا اور اس کو چھپا دیا جاتا۔

قرآن کے کلام اللّٰہ ہونیکا ثبوت قرآن کریم میں اس سورت شریفہ کا موجود ہونا جس طرح حضرت سردار دو جہاں علیہ صلوات الرحمان کے رسول برحق ہونے کی کھلی نشانی ہے۔ اسی طرح اس سورت کریمہ سے قرآن پاک کا کلام اللّٰہ ہونا بھی ثابت ہوتا ہے کہ قرآن کریم کسی بشر کا کلام نہیں نہ حضرت سید البشر صلوات اللّٰہ و سلامہ علیہ الی یوم المحشر کا

ہو سکتا ہے بلکہ یہ ایسی بزرگ و برتر ہستی کا کلام ہے کہ وہ نہ صرف جملہ کائنات بلکہ سید الکائنات علیہ التحیۃ والتسلیمات پر بھی اپنا حکم جاری کرتا اور امر و نہی کے اجرا کا پوری طرح اقتدار رکھتا ہے لطیف سے لطیف تر پیرایہ میں سہی مگر آگاہ فرمایا جاتا ہے کہ آپ نے ایسا کیوں کیا اور ایسا کیوں نہ کیا۔ کہتے ہیں کہ اسی نکتہ کو دریافت کرکے ایک نصرانی عالم بے اختیار کہہ اٹھا کہ واقعی قرآن مجید اللہ کا کلام ہے۔ پھر وہ مسلمان ہو گیا۔ اللہ سبحانہ کی رحمتیں ادن کے شامل حال ہوں۔

ایک منافق کا حال اور اس کا انجام

حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ خلافت میں ایک شخص کہیں نماز پڑھایا کرتا تھا اور نماز میں سورہ عبس ہی اکثر پڑھا کرتا۔ حضرت عمرؓ کو اس کی خبر ہوئی تو آپ نے سمجھ لیا کہ یہ منافق ہے جو اپنے اندرونی کفر کو اپنی امامت اور قرات کے ضمن میں اس طرح ظاہر کر رہا ہے۔ اگر یہ مسلمان ہوتا تو قرآن کریم کی (۱۱۴) سورتوں اور کثیر التعداد رکوعات میں سے صرف اس ایک سورت اور اس ایک رکوع کا انتخاب نہ کرتا۔ فارسل الیہ فضرب عنقہ لما استدل بذلک علی کفرہ و وضع مرتبتہ عندہ و عند قومہ (روح البیان)۔ آپ نے اس کے پاس آدمی بھیجا جس نے اس کی گردن اڑادی۔ کیونکہ اس کے ایسے عمل سے صاف ظاہر تھا کہ حضور سید عالم

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس کے نزدیک کوئی حرمت و وقعت نہیں ہے اور یہی حال اس کی قوم منافقین کا ہے"۔

صورت کا اعتبار نہیں سیرت معتبر ہے

بہرحال ان آیات کریمہ کے ذریعہ یہ تعلیم دیجارہی ہے کہ قلبی کیفیات اور روحانی احوال کا اعتبار ہے ظاہری شکل و صورت اور مال و دولت کا اعتبار نہیں۔ ایمان و اتباع سے انسان کی عزت ہے۔ اللہ سبحانہ نے جس کو دولت ایمان و انقیاد سے سرفراز کیا وہی بلند اور قابل احترام ہے' گو اس کی ظاہری گری ہوئی حالت کے اعتبار سے اہل دنیا اس کی قدر نہیں جانتے۔ اور جو کفر و طغیان میں گرفتار رہا وہ ذلیل ہے اگرچہ لوگوں کی نظروں میں اس کا بڑا اعتبار ہو۔ ارشاد باری ہے:—

ان العزۃ للہ ولرسولہ وللمؤمنین۔ عزت تو صرف اللہ ہی کیلئے ہے اور اس کے رسول کے لئے اور ان پر ایمان رکھنے والوں کے لئے"۔ اسی لئے مذکورہ واقعہ کو بتلا دینے کے بعد ارشاد ہوا:—

کَلَّا۔ ایسا نہ ہونا چاہیئے"۔

یعنی مومن پر کافر کو ترجیح نہ دیجانی چاہیئے خواہ اس میں کیسی ہی مصلحت مضمر ہو۔

تفسیر کلمۂ کَلَّا

اس اعتبار سے کلمۂ کَلَّا حرف ردع قرار پائیگا جو کسی چیز سے

منع کرنے اور روک دینے کے لئے آتا ہے۔ لیکن امام سجاوندی نے یہاں وقف نہیں تبلایا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ انھوں نے اس کلمہ کو حقاً کے معنی میں لیا ہے اس صورت میں کَلَّا کا تعلق کلام مابعد سے ہو گا۔ یعنی حقیقت حال یہ ہے جو آگے بیان ہو رہی ہے۔

(آیات ۱۳ تا ۱۶)

اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ۚ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ ۘ فِیْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ ۙ مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ ۙ بِاَیْدِیْ سَفَرَةٍ ۙ كِرَامٍۭ بَرَرَةٍ ؕ

(حقیقت یہ ہے کہ) یہ نصیحت ہے پس جو چاہے اس سے نصیحت لے۔ معزز ورقوں میں جو رفیع الشان ہیں نہایت ستھرے، ایسے لکھنے والوں کے ہاتھوں سے (لکھے ہوئے) جو بڑے درجے والے نیکوکار ہیں۔

قرآن کریم نصیحت ہے یعنی تمام اعتبارات سے قطع نظر کرکے حقیقت حال معلوم کرنی چاہو تو نفس الامری واقعہ یہ ہے کہ آپ پر جو وحی اتاری جا رہی ہے اور جسکو آپ ان صنادید قریش کے دل میں اتارنا چاہتے ہیں اور وہ ہیں کہ ان کو اس جانب کچھ بھی التفات و رغبت نہیں، اور ایک نابینا مسلمان ہے جو بصد شوق و رغبت اسکو سیکھنے اور اپنے سینے میں محفوظ کرنے اور دل و دماغ کو منور کرنے کے لئے دوڑے دوڑے آرہا ہے وہ آپ کی نظر التفات سے محروم جا رہا ہے۔ یہ وحی (قرآن کریم) نصیحت ہے

لوگوں کا بھلا چاہنے والی، اور بھلائی کی راہ دکھانے والی۔ اس سے وہی فائدہ اٹھا سکتا ہے جو اس کا خواہشمند ہو۔ اور جس کو اس کی خواہش ہی نہیں وہ اس سے کیا خاک فائدہ اٹھا سکتا ہے؟ لہٰذا آپ صرف اپنے پاس آنے والوں کو پیام الٰہی پہنچا دیا کیجئے جو چاہے اس سے نصیحت لے۔ کسی پر جبر نہیں۔ نصیحت لیگا تو اسکو فائدہ پہنچیگا اور جو نہ مانے وہ محروم رہیگا۔

فی صحف مکرمۃ کی تفسیر | فِیْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ۔

معزز ورقوں میں جو رفیع الشان ہیں نہایت ستھرے پاکیزہ۔" پھر قرآن کریم وہ عظیم الشان کتاب جلیل ہے جو معزز ورقوں میں منقوش و مزین ہے۔ اس کے ایک ایک ورق کو دیکھتے ہی اس کو احتراماً بوسہ دیا جاتا، آنکھوں سے لگایا جاتا، اور سینے سے چمٹا لیا جاتا ہے۔

اس رفیع الشان کتاب کو رکوع وسجود میں نہیں پڑھ سکتے | کیوں نہ ہو اس کی شان نہایت رفیع اور عالی ہے ایسی کسی اور کتاب یا ورق کو حاصل نہیں۔ ان صناد ید کے ماننے یا نہ ماننے پر اس کی عظمت و شان موقوف و منحصر نہیں وہ بجائے خود نہایت ہی رفیع الشان ہے۔ تلاوت کیجاتی ہے تو اس کو اونچے مقام پر رکھ کر پڑھا جاتا ہے۔ نماز میں اس کی قراءت ہوتی ہے تو حالت قیام میں پڑھا جاتا ہے، رکوع وسجود میں

نہیں پڑھ سکتے کیونکہ یہ حالت اپنی ذلت اور عجز کے اظہار کی ہے۔ پھر وہ اوراق ستھرے پاکیزہ، ان میں جو لکھا ہے وہ طاہر مطہر اس کا ایک ایک حرف، ایک ایک جملہ ایک ایک آیت، ایک رکوع ایک ایک سورت، ایک ایک جزو اور ایک ایک منزل پڑھتے جاؤ یہاں تک کہ پورا کلام ربانی ختم کرلو پھر دیکھو کہ خیالات میں عقاید میں اقوال میں، اعمال میں، افعال میں، آئندہ کے منصوبوں اور ارادوں میں تمناؤں میں اور دعاؤں میں بلکہ ساری زندگی کے ابواب میں کیسی ستھرائی، پاکیزگی، شگفتگی، اور نکھار پیدا ہوتا ہے۔

بایدی سفرۃ کی تفسیر بِاَیْدِیْ سَفَرَۃٍ کِرَامٍ بَرَرَۃٍ۔ ایسے لکھنے والوں کے ہاتھوں سے لکھے ہوئے جو بڑے درجے والے نیکو کار ہیں" پھر اس کے لکھنے والے۔ ان کی شان کیا پوچھتے ہو وہ بھی ہم سے پوچھو اور ہم سے سنو۔ وہ ایسوں کے ہاتھوں سے لکھا ہوا ہے جو سراپا نیک ہیں، ہمارے پاس ان کی بڑی کرمت اور قدر ہے، ہمارے اکرام و انعام کے مستحق ہیں۔ بَرَرَۃٌ نہایت ہی نیک" علامہ راغب لکھتے ہیں:۔ بررۃ ابلغ من ابرار فانہ جمع بر و ابرار جمع بار۔ یعنی بَرَرَۃٌ کا لفظ ابرار کے مقابلہ میں بلیغ تر ہے کیونکہ بَرَرَۃٌ جمع ہے بَرٌّ کی اور ابرار جمع ہے بارٌ کی بارٌ کے معنی ہیں نیک اور بَرٌّ کے معنی نہایت ہی نیک۔

سفرۃ سے فرشتے مراد ہیں حضرت مجاہدؒ فرماتے ہیں:۔ السفرۃ الکتبۃ من الملائکۃ۔ (عبد بن حمید) سفرہ (جن کے ہاتھوں سے قرآن کریم لکھا گیا ہے اور جن کی صفت کرام بررۃ مذکور ہوئی ہے وہ) فرشتے ہیں" جو وحی الٰہی کو اپنے پاک ہاتھوں سے لکھا کرتے ہیں۔ حضرت ام المؤمنین سیدتنا عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ حضرت معدن الجود والکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔ الذی یقرأ القرآن وھو ماھر بہ مع السفرۃ الکرام البررۃ والذی یقرأہ وھو علیہ شاق لہ اجران (امام احمدؒ، بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ) "جو شخص قرآن کریم کی تلاوت کرتا رہتا ہے درحالیکہ وہ اس میں ماہر بھی ہے وہ قرآن کریم کے لکھنے والوں کے ساتھ ہوگا جو اہل کرم اور حد درجہ نیک ہیں۔ (یعنی کاتبین وحی فرشتوں کے ساتھ۔) اور جو قرآن پاک کی تلاوت جاری رکھتا ہے درحالیکہ اس کی تلاوت اس پر شاق اور دشوار گزار ہے تو اس کے لئے بھی دو اجر ہیں" بعض طرق روایات میں اتنا اضافہ بھی آیا ہے:۔ ویتتعتع فیہ۔ یعنی اس کو ہجے کر کر کے اٹک اٹک کر پلٹا پلٹا کر پڑھتا جاتا ہے" شارحین حدیث فرماتے ہیں:۔ ھو التردد فی الکلام من حصر او عیّ لہ اجران اجر القراءۃ واجر التعب لا یرید

ان اجرہ اکثر من اجر الماھر کیف وھو مع السفرۃ فلہ اجور کثیرۃ۔

(مجمع البحار) یتتعتع سے مراد یہ ہے کہ وہ اس کو دھرا دھرا کر پڑھتا ہے اٹک ہونے کی وجہ سے یا زبان پر کلمہ نہ چڑھنے کی وجہ سے تو اس کو بھی دو اجر ہیں، ایک تلاوت جاری رکھنے کا اور دوسرا اس کی مشقت اٹھانے کا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ایسے شخص کا ثواب، ماہر قرائت کے مقابلہ میں دوہرا ہے؟ اور یہ کیونکر ہوگا کیونکہ ماہر تو وحی الٰہی لکھنے والے فرشتوں کے ساتھ ہوگا اس کو تو بے شمار اجر ملیں گے" بہرحال ان روایات سے پایا جاتا ہے کہ سَفَرَۃٍ کِرَامٍ بَرَرَۃٍ سے فرشتے مراد ہیں۔

کاتبین وحی کی فضیلت ومنقبت عظیمہ

حضرت وہب بن منبہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:۔ بایدی سفرۃ کرام بررۃ ھم اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ (عبد بن حمید، ابن المنذر) بایدی سفرۃ کرام بررۃ سے حضرت مہبط وحی نبی امی سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب رضی اللہ عنہم مراد ہیں"۔ اس روایت کی رو سے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور خصوصاً وہ اصحاب رضی اللہ عنہم جن کے حصے میں کتابت وحی الٰہی کی دولت آئی جن کے نصیب یہ تھے کہ حضرت سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ مبارک وباعظمت کام ان سے لیتے تھے اس میں ان کی بڑی ہی منقبت اور فضیلت پائی جاتی ہے۔ نیز مبارک ہیں وہ ہستیاں جو ان کے بعد سے اب تک

قرآن کریم کی کتابت واشاعت کو اپنا وظیفۂ زندگی بنائے ہوئے ہیں اور کسی نہ کسی طریق سے خدمت قرآن میں مشغول ہیں۔ شکر اللہ سعیہم وکثر امثالہم۔ نیز وہ جو تا قیامت قرآن کریم کی کتابت وغیرہ کے ذریعہ دین متین اسلام اور قرآن عظیم کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں۔

(آیت ۱۷ تا ۲۳)

قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَآ اَكْفَرَهٗ ۝ مِنْ اَيِّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ ۝ مِنْ نُّطْفَةٍ خَلَقَهٗ فَقَدَّرَهٗ ۝ ثُمَّ السَّبِيْلَ يَسَّرَهٗ ۝ ثُمَّ اَمَاتَهٗ فَاَقْبَرَهٗ ۝ ثُمَّ اِذَا شَآءَ اَنْشَرَهٗ ۝ كَلَّا لَمَّا يَقْضِ مَآ اَمَرَهٗ ۝

مارا جائے انسان کہ وہ کس قدر ناشکرا ہے، کس چیز سے بنایا اس کو، ایک بوند سے اسے بنایا پھر اسے طرح طرح اندازوں پر رکھا، پھر اس کے لئے راستہ آسان کردیا پھر اسے موت دی، پھر اسے قبر میں رکھوایا، پھر جب چاہا اٹھا نکالا اس کو، کوئی نہیں اس نے اب تک پورا نہ کیا جو اسے حکم ہوا تھا۔

انسان پر تعجب سخت حیرت اور تعجب کا مقام ہے کہ ایک طرف اللہ سبحانہ تعالیٰ قرآن کریم جیسی باعظمت کتاب جلیل اتار کر اپنے پیارے اور برگزیدہ رسول کے ذریعہ انسان کی حیات شخصی و ملی کا سامان فرما رہا ہے جس سے ان کے شرح صدر اور دل و دماغ کے منور ہونے اور ان میں پاکیزہ اخلاق پیدا ہونے اور پسندیدہ اعمال و

افعال صادر ہونے کا نظم قائم ہوا اور دوسری طرف انسان کا یہ حال کہ وہ کبر و نخوت
میں مبتلا رہ کر تحصیل سعادت و کمال سے استغنا برتے اور اپنے ہی ہاتھوں اپنی موت
کا سامان فراہم کرتا رہے۔ ایسے انسان کو گردن زدنی نہ کہا جائے تو اور کیا کہا
جا سکتا ہے؟ اسی لئے ارشاد ہو رہا ہے:۔ قُتِلَ الْإِنْسَانُ مَا أَكْفَرَهُ ـــ
مارا جائے انسان کہ وہ کس قدر ناشکر ہے" کہ اِدھر سے یہ فضل و عطا اور اُدھر سے
وہ تمرد و خطا۔

من ای شیئ خلقه کی تفسیر | مِنْ أَيِّ شَيْءٍ خَلَقَهُ مِنْ نُطْفَةٍ
اس کو ذرا تو غور کرنا چاہیئے کہ وہ ہے کیا چیز اور کیا تھی اس کی حقیقت؟ وہ کیا سے کیا
بنا اور کس طرح بنا اور بنانے والے نے اس کے بنانے کا کیا کچھ اہتمام نہ فرمایا؟ اسکی
مختصر حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک زمانے تک کچھ نہ تھا۔ پھر مشیت الٰہی کارفرما ہوئی تو صلب
پدر میں کچھ پانی پیدا ہوا۔ اور اس پانی کی ایک بوند سے اس کی آفرینش ہوئی۔ وہ بوند
رحم مادر میں پرورش پاتی اور ترقی کے مدارج طے کرتی رہی۔ ایسی تنگ و تاریک جگہ جسکی
کسی کو خبر نہیں اور جہاں کسی کی رسائی نہیں۔ انسانی دسترس سے باہر۔

خلقه فقدره کی تفسیر | خَلَقَهُ فَقَدَّرَهُ "اُسے بنایا پھر اُسے طرح طرح کے
اندازوں پر رکھا" وہیں کئی طرح کے انقلابات اور تغیرات آتے رہے۔ اور اس کے

اطوار بدلتے گئے۔ تھی تو وہ پانی کی ایک بوند پھر اس کو بنایا گیا خون، پھر بستہ خون، پھر گوشت کی ایک بوٹی، پھر اس میں پیدا ہوا ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ، پھر ان کو رگ پٹھوں سے بنایا گیا مضبوط و استوار، پھر اس پر منڈھا گیا گوشت اور تراشے گئے اعضاء، پھر اس میں پھونکی گئی روح اور لکھی گئی اس کی تقدیر، ودیعت کئے گئے اس میں حواس ظاہری و باطنی، اور رکھی گئی اس میں صلاحیت و استعداد فہم و ادراک کی، عقل و ذکاء کی، علم و حکمت کی، اکتساب کمال کی، اب تک وہ تھا جنین (پیٹ میں کا بچہ)۔

ثم السبیل یسرہ کی تفسیر اب وہ آنا چاہتا ہے باہر لیکن آنے کی راہ نہیں ملتی تھی

ثُمَّ السَّبِيلَ يَسَّرَهُ۔ "پھر اس کے لئے راستہ آسان کر دیا"۔ جب وہ قطرہ تھا تو ایک تنگ و تاریک جگہ محفوظ تھا۔ کسی کو خبر تک نہ تھی کہ یہاں کچھ محفوظ ہے۔ پھر جیسا جیسا بڑھتا اور ترقی کرتا گیا تو اس کے ساتھ ساتھ اس کا مکان بھی وسعت پذیر ہوتا گیا۔ تا آنکہ ہر کوئی دیکھنے والا یہ سمجھنے لگا کہ کسی مہمان کی اس مہمان خانے میں آمد ہو رہی ہے، جب وضع حمل کا زمانہ قریب ہوا اس کے باہر آنے کی سہولت پیدا کر دی گئی۔ نہ صرف باہر آنے کی راہ بلکہ ہر طرح کی راہیں کھول دیں کہ وہ باہر آ کر دن دونی رات چوگنی ترقی و عروج کے منازل طے کرتا رہے۔

انسان کی ناانصافی حضرت محمد بن کعب قرظی فرماتے ہیں: قرأت فی التوراۃ او قال فی مصحف ابراھیم فوجدت فیھا یقول اللہ یا ابن آدم ما انصفتنی خلقتك ولم تك شیئا وجعلتك بشرا سویا وخلقتك من سلالۃ من طین ثم جعلتك فی قرار مکین ثم خلقت النطفۃ علقۃ فخلقت العلقۃ مضغۃ فخلقت المضغۃ عظاما فکسوت العظام لحما ثم انشأتك خلقا آخر یا ابن آدم ھل یقدر علی ذلك غیری۔ میں نے توریت شریف یا سیدنا ابراہیم کے مصحف شریف میں پڑھا ہے جس میں یہ لکھا ہوا پایا کہ اللہ سبحانہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔ اے آدم کے بیٹے! تو نے میرے ساتھ انصاف کا معاملہ تک نہ کیا (قدر دانی تو رہی ایک طرف کیونکہ انصاف تو ہوتا ہے اجنبیوں اور غیروں کے مقابلے میں، اور اپنوں کی قدر کیجاتی ہے) تجھے میں نے ایسی حالت میں پیدا کیا جب کہ تو کچھ بھی نہ تھا، میں نے تجھے کامل و مکمل انسان بنایا۔ تیری آفرینش کا آغاز سڑی ہوئی مٹی سے ہوا پھر تجھے (ایک بوند کی شکل دیکر) نہایت محفوظ مقام میں ٹھہرایا۔ پھر اس بوند کو خون اور منجمد خون بنایا۔ پھر اس خون کو گوشت کی بوٹی پھر بوٹی میں ہڈیاں پیدا کیں پھر ان ہڈیوں پر گوشت چڑھایا۔ پھر تجھے ایک مکمل مخلوق بنا کر دوسری قسم کا وجود بخشا۔ اے آدم کے بیٹے! ایسا کرنے پر میرے سوا

اور کوئی اس کائنات میں ایسی قدرت رکھتا ہے ؟ (نہیں ہرگز نہیں)۔"

بچے کی ماں پر اللہ کی رحمت ثمّ خففت ثقلك علی امك حتی لا تتمرض بك ولا تتاذی، ثم اوحیت الی الامعآء ان اتسعی، و الی الجوارح ان تفرقی فاتسعت الامعآء من بعد ضیقها وتفرقت الاعضآء من بعد تشبیکها۔ پھر تیری ماں پر تیرا بوجھ ہلکا کر دیا تاکہ وہ تیری وجہ سے بیمار نہ پڑ جائے اور تیری وجہ سے اس کو کسی قسم کی ایذا نہ پہنچے (ورنہ پیٹ کا یہ حال ہے کہ ایک لقمہ بھی زیادہ پہنچ جائے تو وہ بوجھ بن جاتا ہے اور جب تک وہ خارج نہ ہو آرام نہیں ملتا مگر تیری ماں کے پیٹ کا یہ حال رہا کہ تو جینے تک تو ایسی جاگزیں رہا وہ چلتی پھرتی، کھاتی پیتی، ہنستی بولتی، کام کاج کرتی رہی) پھر میں نے (تیری) آنتوں کو حکم دیا کہ وہ کشادہ ہو جائیں اور (تیرے) اعضائے ظاہری کو حکم بھیجا کہ وہ ایک دوسرے سے جدا جدا ہو جائیں۔ چنانچہ آنتیں جو تنگ تھیں کشادہ ہو گئیں اور اعضاء جو ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے الگ الگ ہو گئے۔"

فرشتوں کے ذریعہ بچے کی خدمت ثم اوحیت الی الملك الموکل بالارحام ان یخرجك من بطن امك فاستخلصتك علی ریشة من جناحه، فاطلعت علیك فاذا انت خلق ضعیف لیس لك سن یقطع

ولاضرس یطحن' فاستخلصت لك فی صدر امك عرقا یدر لك لبنا بارداً فی الصیف حاراً فی الشتاء' واستخلصته لك من بین جلد ولحم ودم وعروق۔ پھر میں نے فرشتے کو جو ارحام کی حفاظت کے لئے مقرر ہے حکم دیا کہ وہ تجھے تیری ماں کے پیٹ سے باہر نکال لائے۔ اس طرح میں نے اس کے بازوؤں کے ریشوں پر تجھے وہاں سے چھڑا نکالا' اب یہ دیکھ کر کہ تو ایک ناتواں کمزور مخلوق ہے۔ نہ تجھے دانت ہیں جو غذا کو توڑ سکیں اور نہ داڑھیں میسر ہیں جو اس کو چبا اور پیس سکیں تو میں نے تیری خاطر تیری ماں کی چھاتیوں میں ایک رگ کو اس قابل بنایا جس سے دودھ اترتا رہے جس کی صفت یہ ہو کہ گرما کے موسم میں تو وہ ٹھنڈا ٹھنڈا رہے اور سرما میں گرم گرم' پھر میں نے جلد اور گوشت اور خون اور رگوں کے درمیان سے یہ خالص دودھ بنا نکالا۔"

والدین کی شفقت اللہ کی رحمت

ثم قذفت لك فی قلب والدتك الرحمة و فی قلب ابیك التحنن فهما یكدان ویجهدان ویربیانك ویغذیانك فلما قطع سنك وطحن ضرسك اطعمتك فاكهة الصیف فی اوانها' وفاكهة الشتاء فی اوانها۔ پھر میں نے تیری خاطر تیری ماں کے دل میں رحمت وشفقت' اور تیرے باپ کے دل میں محبت وہمدردی

ڈال دی۔ اب ان دونوں کا یہ حال ہے کہ وہ دونوں مل کر جدوکد اور محنت و مشقت میں لگے ہوئے ہیں اور تیری تربیت و پرورش کئے جا رہے ہیں اور تیرے کھانے پینے کے انتظام میں مشغول ہیں۔ پھر جب تیرے دانت اس قابل ہوئے کہ غذا کو توڑ سکیں اور تیری داڑھیں اس قابل ہوئیں کہ اس کو چبانے اور پیسنے لگیں تو میں نے تجھے طرح طرح کے میوے کھلائے۔ گرما کے میوے اپنے وقت پر اور سرما کے میوے اپنے موسم پر"

انسان کی ناشکری اور اس کا علاج

فلما ان عرفت انی ربک عصیتنی فالان اذعصیتنی فادعنی فانی قریب مجیب وادعنی فانی غفور رحیم۔ (ابونعیم) اب جبکہ تو نے خوب پہچان لیا کہ تیری پرورش و تربیت کرنے والا پروردگار ابتدا سے اس وقت تک بلکہ آئندہ بھی ہمیشہ ہمیشہ کیلئے میں ہی ہوں اور صرف میں، تو میرے احکام کی نافرمانی کرنے لگا اور میرے ہی خلاف کیا جا رہا ہے۔ لہٰذا اب جبکہ تو میرے احکام کی خلاف ورزی کئے جا رہا ہے تو خیر مضی ما مضی اب بھی وقت ہے کہ میرے آگے ہاتھ پھیلا مجھ سے مانگ اور مجھے پکار کیونکہ میں سب سے قریب تر اور تجھ سے نزدیک تر ہوں تیری دعا کو قبول کرنے کیلئے اب بھی آمادہ ہوں میرے ہی آگے دعا کرتا رہ کیونکہ میں بڑا بخشنے والا اور نہایت ہی مہربان ہوں"

موت اور قبر بھی اللہ کی نعمت

ثُمَّ اَمَاتَهٗ فَاَقْبَرَهٗ ۔ پھر اس کو موت دی پھر اس کو قبر میں ٹھہرایا۔ یعنی اس زندگی کی مدت کے ختم پر انسان کو موت سے سابقہ پڑا۔ معلوم ہوا کہ موت بھی اللہ سبحانہ کی بہت بڑی نعمت ہے جبھی تو سابقہ نعمات اور احسانات کے سلسلے میں اس کا بیان فرمایا جا رہا ہے۔ یہی نہیں بلکہ مرنے کے بعد اس کو قبر میں ٹھہرانے کا انتظام فرمایا۔ غور کرو تو موت اور موت کی طرح قبر بھی ایک جداگانہ بڑی نعمت ہے۔ موت نعمت اس لئے ہے کہ اسکی بدولت تمام تکالیف شرعیہ برخاست ہو جاتی ہیں۔ طہارت، نماز، روزہ، زکاۃ، حج اور جہاد وغیرہ سارے فرائض و واجبات ساقط ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح تمام تر ذمہ داریاں جو تحصیل معاش اور دوسروں کی خبرگیری وغیرہ کے متعلق عائد حال تھیں وہ سب کی سب ختم ہو جاتی ہیں۔ اب دنیا میں جو واقعہ بھی گزرے مرے ہوئے آدمی کو اس سے کوئی تعلق نہیں۔ چنانچہ حدیث شریف ہے:۔ اَلْمَوْتُ تُحْفَةُ الْمُؤْمِنِ "موت مومن کے حق میں ایک گراں بہا تحفہ ہے" یہی وجہ ہے کہ انسان جب مصائب و آلام میں گرفتار ہو جاتا ہے اور کوئی تدبیر ان سے خلاصی اور رستگاری کی کارگر ہوتی نظر نہیں آتی تو وہ موت کو یاد کرتا ہے۔ کتنے نا صبور انسان ایسی حالت میں خودکشی پر آمادہ ہو جاتے اور کتنے ہی خودکشی کر لیتے ہیں حالانکہ

شرع شریف میں اس کی سخت ممانعت آئی ہے۔ اللھم احفظنا۔

موت تحفۂ مومن پھر موت مومن کے لئے جس طرح نادر تحفہ ہے ایسا ہی رفیق اعلیٰ اللہ سبحانہ سے جاملنے کا واحد ذریعہ ہے۔ اسی لئے کہا جاتا ہے:۔ الموت جسر یوصل الحبیب الی المحبوب۔ موت ایک پُل ہے جو ایک دوست کو اس کے محبوب سے ملاتا ہے" سب کو اس پُل سے گزرنا لازم ہے۔ کسی کو اس سے بچنا ممکن نہیں۔ عمر بھر میں جو کچھ کیا ہے اس کی جزا موت کے بعد ہی ملیگی۔ جب نتیجۂ زندگی کا حصول اس پر موقوف ومنحصر ہے تو موت بھی اللہ سبحانہ کی بڑی نعمت ٹھہری۔ اسی وجہ سے حدیث شریف میں آیا اور حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔ اکثروا ذکر ھاذم اللذات۔ تمام لذتوں کو قطع کرنے والی چیز یعنی موت کا ذکر بکثرت کرتے رہو" اس سے ہر مصیبت آسان اور طاقت صبر پیدا ہوتی ہے جو نصف ایمان اور تمام کامیابیوں کا پیش خیمہ ہے۔

دفن کی فضیلت اسی طرح میت کے لئے قبر ایک فطری سادہ سہل الحصول مقام ہے جس سے بہتر اور کوئی صورت نہیں ہوسکتی۔ ہاں اگر کسی کا وقت آخر کسی سمندری سفر کے سلسلہ میں آپہنچے تو اس کو پانی میں چھوڑ دینا چاہیئے۔ انسان کی آفرینش اسی آب وگل سے ہوئی تھی۔ یہی دونوں چیزیں اس کے لوازم زندگی تھے۔ اس کے

کھانے پینے اور عیش و آرام کی ساری سہولتیں آب و گل سے ہی میسر ہوتی تھیں۔ ان ہی دو چیزوں سے اس کی طہارت اور پاکیزگی کا سامان، وضو، غسل اور تیمم کی صورت میں کیا گیا تھا گویا انسان کا وجود ابتدا سے انتہا تک اسی آب و گل کی امانت کا مجموعہ تھا۔ اور یہ قفس عنصری اسی سے تیار ہوا تھا۔ اب جبکہ روح نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا اور روح انسانی رفیق اعلیٰ سے جا ملی تو اس کالبد انسانی کو جو درحقیقت آب و گل کی امانت تھی اس کو آب و گل ہی کے سپرد کر دینا حق بحقدار رسید کا مصداق ہے۔ لہٰذا جو حکم انسان کو بعد مردن قبر میں دفن کر دینے سے متعلق دیا گیا۔ یا پانی پر اس کی موت واقع ہوئی تو اس کو پانی میں چھوڑ دینے کا حکم آیا تو عقل و نقل ہر اعتبار سے مناسب و موزوں اور افضل و اعلیٰ ہوا۔

میت کو جلانا غیر فطری ہے ایسے سادہ، سہل الحصول فطری طریق کو چھوڑ کر بعض لوگوں نے آگ میں جلا دینے یا جانوروں کا لقمہ بنا دینے کا جو خود ساختہ طریقہ اختیار کر لیا ہے اور اس سے بڑھ کر بعض قومیں جو اسکو خود ہی کھا لیا کرتی ہیں جس کو سن کر بدن پر رونگٹے کھڑے ہو تے ہیں ان کی نسبت ہم کچھ کہنا نہیں چاہتے وہ خود ہی اپنے نزدیک غور کر لیں کہ ان کا یہ عمل امانت الٰہیہ کی ادائی اور تسلیم و تفویض سے کس درجہ مطابقت کھاتا ہے جب امانت الٰہیہ اور اپنی ہی میت کے ساتھ ان کا آخری سلوک اس نوعیت کا ہے تو زندگی کے دوسرے شعبوں میں اوروں کے حقوق اور امانات کی ادائی کی ان سے کیا توقع ہو سکتی ہے؟ فاعتبروا

یا اولی الابصار۔ اگر یہ خیال ہو کہ اس طرح میت کو جلا دینے اور اس کی راکھ کو ہوا میں اڑا دینے یا پانی میں بہا دینے سے دوبارہ اس کو زندہ کرکے لا کھڑا کرنا ممکن نہ ہو سکیگا۔ یا اس کو برزخ کے سوال و جواب اور عذاب قبر سے نجات مل جائے گی تو ایسا خیال محض ایک خیال خام ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کو واقعہ نفس الامری اور اللہ سبحانہ کی قدرت قاہرہ کا علم ہی نہیں۔ میت کا جو کوئی جزو جہاں کہیں بھی رہے درندے کے پیٹ میں یا پانی یا ہوا میں یا کسی دوسرے انسان کے پیٹ میں وہی اس کی قبر ہے اور وہیں اس سے باز پرس ہوگی اور جزا و سزا مرتب ہوگی۔ اللہ سبحانہ کی قدرت سے کچھ بھی بعید نہیں جب کہ ساری کائنات اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے۔

حشر و نشر

ثُمَّ اِذَا شَآءَ اَنْشَرَهٗ ۔ پھر جب چاہا اس کو لا کھڑا کیا" خواہ کوئی زمین میں دفن ہو یا پانی میں بہا دیا گیا ہو یا آگ میں جلا دیا گیا یا کسی پرندے یا درندے کو کھلا دیا گیا یا اسی کے بنی نوع ہی نے اسکو اپنا لقمہ بنا لیا۔ جو بھی صورت ہو جب مشیت الٰہی جاری ہوگی کہ اس کو دوبارہ زندہ کرکے اٹھایا جائے تو وہ اس کو اٹھا کر میدان محشر میں لا کھڑا کریگا۔ زمین ہے تو اس کے زیر فرمان ہے۔ پانی ہے تو اسکے حکم میں ہے۔ ہوا پر اس کا حکم جاری ہے درندے چرند پرند و حشرات الارض اسکے حکم کے آگے سر جھکائے ہوئے ہیں۔ جس طرح ساری کائنات

اس کے تابع فرمان ہے کسی کی کیا مجال کہ اس کے حکم کے آگے دم مار سکے یا اسکے حکم سے سرمو سرتابی کر سکے۔ حکم ہوتے ہی آن کی آن میں دیکھتے دیکھتے تعمیل ہو جائیگی۔ اور از آدم تا ابن دم جس جس کو حاضری کا حکم ہوگا خواہ وہ کہیں ہو اور اس کا ذرہ ذرہ بکھر گیا ہو۔ تمام ذرات ایک جگہ جمع ہو کر سب اٹھ کھڑے ہوں گے۔ کافر اگرچہ عمر بھر حشر اجساد کا انکار کرتے رہے ہوں مگر وقت آنے پر طوعاً و کرہاً سب کو حاضری دینی ہوگی۔ قال لھا وللارض ائتیا طوعا او کرھا قالتآ اتینا طائعین۔ جب اللہ سبحانہ نے آسمانوں اور زمین کو بنایا تھا تو حکم دیا تھا کہ میرے پاس آؤ۔ خوشی سے یا زبردستی سے۔ تو آسمان و زمین دونوں نے عرض کیا تھا کہ ہم شوق و رغبت سے آ حاضر ہو گئے۔ یہی حال آخرت کا بھی ہوگا کہ حکم کے ساتھ ہی سب کے سب آ کھڑے ہوں گے۔ مگر دنیا میں انسان کا عجب حال ہے۔

لمّا یقض ما امرہ کی تفسیر | كَلَّا لَمَّا يَقْضِ مَآ اَمَرَهٗ۔ کچھ نہیں اس نے ابتک اس کے حکم کو پورا نہ کیا۔" ساری کائنات علوی ہو یا سفلی ہمارا حق پہچانتی اور ہمارے ہر حکم کے آگے سربسجود ہے یہاں تک کہ انسان کے تمام اعضاء و جوارح اسکے بال اور ناخن ایک ایک رونگٹا تک جو اس کے حکم کے مطابق اپنے نمو اور ترقی میں لگا ہوا ہے

اپنا فرض انجام دے رہا ہے مگر کوتاہی پائی جاتی ہے تو انسان میں اور صرف انسان میں کہ اس نے اپنے خالق کے عائد کئے ہوئے فریضہ کی اب تک تکمیل نہ کی ہر فرض کو پورا پورا انجام دینا یہ تو بہت بڑی بات ہے۔ حضرت قتادہؒ فرماتے ہیں:۔ لا یقضی احد ابدا کل ما افترض علیہ۔ فریابی عبد بن حمید ابن المنذر) اس کے ہر فریضہ کو کوئی بھی پورا نہیں کیا اور نہ کرسکتا ہے" گو انسان کو اشرف المخلوقات بنانے کا تقاضا تو یہی تھا۔ مگر پورا کرنا تو کیسے کرسکتا۔ سب سے پہلے فرض شناسی کی ضرورت ہے۔ بہتیرے انسان اسی میں پیچھے ہیں بلکہ فرض کے منکر۔ اگر کوئی فرض کو فرض سمجھے تو اس کے بعد اس کی ادائی کے طور طریق پر غور کرے اس کا سامان فراہم کرے۔ تب کہیں ادائے فرض کی نوبت آئے۔ یہ تو منکر فرض ہیں۔ ان سے کیا توقع ہوسکتی ہے؟ جو فرض شناس ہیں ان کو ادائے فرض کی دھن لگی ہوئی ہے۔ وہ اس کے اسباب فراہم کرنے اور اس کو ادا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ رات دن اسی تگ و دو میں لگے ہوئے ہیں ایک ایک فرض انجام دیتے ہیں پھر کہتے ہیں:۔ ما عرفناك حق معرفتك وما عبدناك حق عبادتك۔ اے پروردگار عالم! آپ کو پہچاننے کا جو حق ہے اتنا ہم نہیں پہچان سکے اور آپ کی بندگی کا حق جس طرح ادا کرنا چاہیئے ہم سے ادا نہ ہوسکا:۔

جان دی دی ہوئی اُسی کی تھی حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

جب عارفین کاملین اور فرمانبردار مطیعین کا یہ حال ہے تو ما و شما کا کیا ذکر؟ لیکن اللہ سبحانہ تعالیٰ کو انسان کی یہ عاجزی اور اس کا اظہار اور اپنی کوتاہی کا ایسا اقرار ہی پسند ہے۔ اور یہ صفت پیدا ہوتی ہے حق پہچاننے، اس کا سامان کرنے اور ادائے حق کی سعی کرنے ہی سے۔ ورنہ کچھ نہیں۔

آگے اس کا بیان ہو رہا ہے کہ یہ جذبہ پیدا ہوتا ہے اللہ سبحانہ کے کم از کم ان احسانات پر غور کرنے سے۔ چنانچہ ارشاد ہو رہا ہے:۔

فَلْيَنظُرِ الْإِنسَانُ إِلَىٰ طَعَامِهِ ۝ أَنَّا صَبَبْنَا الْمَاءَ صَبًّا ۝ ثُمَّ
شَقَقْنَا الْأَرْضَ شَقًّا ۝ فَأَنبَتْنَا فِيهَا حَبًّا ۝ وَعِنَبًا وَقَضْبًا[1] ۝

۷۰ (عبس ۲۴ تا ۳۲)

[1] قضباً ای رطبۃ والمقاضب الارض التی تنبتها والقضیب نحو القضب لکن القضیب یستعمل فی فروع الشجر والقضب یستعمل فی البقل والقضب قطع القضب والقضیب وروی ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان اذا رأی فی ثوب تصلیباً قضبہ وسیف قاضب وقضیب ای قاطع فالقضیب ھھنا بمعنی الفاعل وفی الاول بمعنی المفعول (مفردات) قضباً سے تر چیزیں مراد ہیں۔ اور مقاضب وہ زمین جو تر چیزوں کو اگاتی ہے۔ قضیب بھی قضب کے معنی میں آتا ہے لیکن فرق یہ ہے کہ قضیب

وَّ زَيْتُوْنًا وَّ نَخْلًا ۙ وَّ حَدَآئِقَ غُلْبًا ۙ وَّ فَاكِهَةً وَّ اَبًّا ۙ مَّتَاعًا

لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ ؕ اب چاہیئے کہ دیکھے انسان اپنے کھانے کو کہ ڈالا ہم نے پانی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

درخت کی شاخہائے ترکو کہتے ہیں اور قضب کا استعمال ترکاریوں اور سبزیوں میں ہوتا ہے۔ مروی ہے کہ حضرت نبی کریم علیہ التحیۃ والتسلیم جب کپڑے میں کلف پاتے تو اسکو توڑ دیتے۔ (گویا قضب کے معنی کاٹنے اور توڑ دینے کے بھی آتے ہیں۔) محاورہ عرب ہے: سیف قاضب و قضیب یعنی تلوار کاٹنے والی ہے۔ لہٰذا لفظ قضیب یہاں فاعل کے معنی میں آیا ہے یعنی کاٹنے والی۔ اور اوپر جو قضیب کا لفظ آیا ہے وہ بمعنی مفعول ہے یعنی درخت سے کاٹی ہوئی شاخ۔ بہرحال آیہ کریمہ میں قضباً کے معنی ہیں ترکاری و سبزی۔

۲؎ الاغلب الغليظ الرقبة يقال رجل اغلب وامرأة غلباء اى عظيمة الرقبة والجمع غُلب قال وحدائق غُلباً۔ (مفردات) اغلب سے موٹی گردن والا مراد ہے۔ عرب کہتے ہیں رجل اغلب و امرأة غلباء موٹی گردن والا شخص یا موٹی گردن والی عورت اسکی جمع غُلب آتی ہے۔ ارشاد باری ہے۔ وحدائق غُلباً اور پیدا کیئے درخت موٹی اور بڑی تنہ والے۔

۳؎ الاَبّ المرعى المتهيئ للرعى والجزّ من قولهم ابّ لكذا اى تهيّأ ابّاً و ابابة و ابابا و ابّ الى وطنه اذا نزع الى وطنه نزوعا تهيّأ لقصده و كذا ابّ

اوپر سے گرتا ہوا، پھر چیرا زمین کو پھاڑ کر پھر اُگایا اس میں اناج، اور انگور اور ترکاری اور

زیتون اور کھجوریں، اور گھنے باغ، اور میوہ اور چارہ، کام چلانے کو تمھارا اور تمھارے چوپایوں کے"

سامان حیات انسان کے آغاز اور انجام کا بیان فرمانے کے بعد اس کی بقا کا جو انتظام فرمایا گیا ہے اب اس کا بیان ہو رہا ہے کہ انسان کے نمو اور بقا کے لئے ضرورت ہے غذا کی۔ لہذا کم از کم انسان کو اپنی غذا کے انتظام و اہتمام ہی پر غور کرنا چاہیے کہ اللہ سبحانہ نے اس کے لئے کیا کیا تیاری کی ہے؟ نباتات اس کی عام غذا ہیں۔ اور یہ موقوف و منحصر ہیں پانی پر۔ اللہ نے اپنی قدرت کاملہ سے اس کا ایسا اہتمام فرمایا کہ زمین سے جو بخارات اٹھتے ہیں ان کو آسمان پر جمع کر کے وہاں سے برسانا شروع کیا۔ بارش پہاڑوں جنگلوں، دریاؤں، اور خالی زمین سبھی جگہ برستی ہے اور کائنات ارضی کا ذرہ ذرہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ ع ۳)

لسیفہ اذا تھیأ لسلہ واباان ذلک فِعلان منہ وھو الزمان المھیأ لفعلہ و مجیئہ (مفردات)

چارہ جو چرنے یا کاٹے جانے کے قابل ہو اس کو اب کہتے ہیں۔ عرب کا محاورہ ہے اب لکذا۔ فلاں کام کے لئے تیار ہوا۔ اس کا مصدر اَبًّا، اِبابۃً، اِبابًا ہے۔ اور اب الی وطنہ اس وقت کہتے ہیں جب کوئی اپنے وطن جانے کیلئے تیار ہو کر نکل پڑے اور اب لسیفہ کہتے ہیں جب اپنی تلوار کی سل کھول دے۔ اِبّان بروزن فِعلان سے وہ وقت مراد ہوتا ہے جو کسی کام کے کرنے کا ہو اس وقت آنا ہو۔"

اس سے سیراب ہوتا ہے۔ اور اسی ذریعہ سے زمین نرم اور قابل کاشت بنتی رہے۔ برسات کا موسم آتا ہے تو کسان اس کو صاف کرتے اور برسات کے منتظر رہتے ہیں۔ بارش ہوتے ہی کاشت کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ تخم ریزی کیجاتی ہے۔ اس حد پر انسان کا کام ختم ہوجاتا ہے۔ تخم کو نبات کی شکل دینا دست قدرت میں ہے جس طرح پانی برسانا قدرتی کام تھا پھر گھاس کے تنکے کی مجال نہیں کہ وہ زمین کو شق کرکے سر اٹھا سکے۔ یہاں بھی قدرت ہی معاون و مددگار ہوتی ہے اسی لئے ارشاد ہوا انا صببنا الماء صبا ثم شققنا الارض شقا "ہم نے ہی پانی برسایا اور ہم نے ہی زمین کو شق کیا" کیونکہ یہ کام کسی اور کے ذریعہ تکمیل نہیں پاسکتا۔ پھر اس تخم کو اگایا بھی تو ہم ہی نے :—

فانبتنا فیھا۔

ہفت گونہ رزق اب یہ تخم مختلف النوع ہیں۔ اناج، انگور، ترکاری، زیتون کھجور، گھنے باغ، میوے، اور چارہ۔ ان میں سے گھنے باغ کے سوا باقی جن چیزوں کا بیان فرمایا گیا ہے وہ سب تخم سے پیدا ہونی والی ہیں۔ باغ اور کھیتیاں ان کے پیدا ہونیکی جگہ ہے۔ اناج میں سبھی قسم کے غلے داخل ہیں جو انسان کی خالص غذا ہیں۔ انگور اور کھجور غذا بھی ہیں اور میوہ بھی۔ ترکاری میں ہمہ قسم کا ساگ داخل ہے۔ بھاجی کی قسم سے ہو یا آلو بیگن، کدو، شلجم وغیرہ، زیتون میں روغن دار حبوب بھی شامل ہیں،

جیسے تل، خشخاش وغیرہ نیز ککڑی، خربزہ، تربوز کا شمار بھی اسی میں ہے۔ نیز عربستان میں زیتون اور کھجور کی پیداوار بکثرت ہوتی ہے اس لئے بطور خاص ان کو بیان فرمایا گیا ہے۔ میوے میں ہر قسم کا میوہ شریک ہے۔ خواہ اس کو بطور ذائقہ و تفریح طبع استعمال کیا جائے۔ یا غذا اور میوے کے طور پر یا تفکہ اور دوا کے طریق پر۔ جیسے انار، سیب وغیرہ۔ یہ تمام چیزیں انسانوں کے لئے ہیں۔ اور چارے میں گھاس۔ پات۔ کڑبی۔ گٹھلیاں، جن کو جانور کھاتے ہیں داخل ہیں۔ پھر یہ جانور چونکہ کھیتی باڑی کے کام کرتے ہیں۔ نیز ان کا دودھ اور گوشت انسان کے کام آتا ہے اس لئے چارہ بھی انسان کے لئے خاص نعمت ٹھہرا، گو یہ نعمت بالواسطہ ہی کیوں نہ ہو۔ بہرحال یہاں سات نعمتوں کا بیان فرمایا گیا ہے۔ حدیث شریف میں ہے: خلقتم من سبع ورزقتم من سبع فاسجدو اللہ علی سبع۔ تم سات چیزوں سے بنائے گئے ہو، اور تمہارا رزق بھی سات چیزوں سے مقرر کیا گیا ہے لہذا اللہ سبحانہ کے آگے سات اعضا سے سجدہ کرتے رہو۔ پیدائش جن سات چیزوں سے ہوئی، وہ نطفہ، خون، بستہ خون، گوشت، ہڈی، اعضا کی تراش، پھر ان میں روح پھونکی جانا مراد ہے۔ جس کا بیان مختلف مقامات پر فرمایا گیا۔ سات قسم کا رزق وہی ہے جو ان آیات کریمہ میں بیان فرمایا گیا اور سجدے کے سات اعضا دونوں ہاتھ دونوں گھٹنے، اور دونوں پاؤں اور ایک سر یہ بھی سات ہوئے۔ اسطرح

سجدہ کرنا کیا ہے؟ مذکورہ بالا نعمتوں کے شکر کی صورت ہے۔

ایک نکتہ اس میں ایک نکتہ یہ ہے کہ انسان جب سجدے میں ہوتا ہے تو اس کا پورا جسم حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسم مبارک محمدؐ کی شکل اختیار کرتا ہے اور آپ کا نام مبارک بھی اللہ سبحانہ کو جس درجہ محبوب ہے وہ بالکل ظاہر ہے۔ نیز اس میں اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ حضورؐ کو عبدیت کاملہ حاصل ہے جس سے تمام پیغمبروں میں آپ کا امتیاز پایا جاتا ہے۔ پھر حدیث شریف میں ہے کہ انسان جب اللہ سبحانہ کی جناب میں سربسجود ہوتا ہے تو اللہ سبحانہ سے قریب تر ہوتا ہے۔ لہٰذا اللہ سبحانہ کے آگے سجدہ کر کے تقرب الٰہی حاصل کیا جا سکتا ہے اور تخلیق رزق کی نعمتوں کا شکر بھی اس کے ضمن میں ادا ہوتا ہے اور محمدؐ کی شکل اختیار کر کے درجہ محبوبیت کی تحصیل اس کے علاوہ ہے جو تمام مدارج کمال میں بالاتر درجہ ہے۔ مبارک ہیں وہ ہستیاں جو اللہ سبحانہ کے آگے سربسجود رہتی ہیں۔ نیز یہ کہ جنین جب تک رحم مادر میں رہتا ہے اس کی شکل بھی یہی ہوتی ہے۔

خدایا از تو می خواہم محمدؐ محمدؐ را ز تو می خواہم خدا را (آمین)

حضرت صدیق اکبرؓ کا تاثر حضرت ابراہیم تیمی فرماتے ہیں کہ حضرت سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے آیہ کریمہ وفاکھۃ وابا میں جو کلمہ اَبًّا وارد

ہوا ہے اس کی تفسیر دریافت کی گئی۔ تو آپ نے فرمایا:۔ ای سماء تظلنی وای ارض تقلنی اذا قلت فی کتاب اللہ مالا اعلم۔ (ابوعبید عبدبن حمید) کونسا آسمان مجھ پر سایہ فگن ہوگا اور کونسی زمین مجھے اٹھائیگی اور پناہ دیگی جب کہ میں اللہ کی کتاب میں کوئی کلام کروں جس کو میں نہیں جانتا"۔ اسی طرح حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالی عنہ کا واقعہ مشہور ہے جس کو حضرت انس اس طرح بیان فرماتے ہیں:۔ ان عمر قرأ علی المنبر فانبتنا فیھا حبا و عنبا و قضبا و زیتونا و نخلا و حدائق غلبا و فاکھۃ و ابا متاعا لکم ولانعامکم۔ قال کل ھذا قد عرفناہ فما الاب ثم رفض عصا کانت فی یدہ فقال ھذا لعمر اللہ ھو التکلف فما علیک ان لا تدری ما الاب اتبعوا ما بین لکم ھداہ من الکتاب فاعملوا بہ ومالم تعرفوہ فکلوہ الی ربہ۔ (سعید بن منصور ابن جریر ابن سعد عبد بن حمید ابن المنذر ابن مردویہ بیہقی خطیب حاکم بروایت صحیحہ)

حضرت عمر رضی اللہ تعالی عنہ نے خطبہ دیتے ہوئے منبر پر آیات کریمہ فانبتنا فیھا حبا سے وابا متاعا لکم ولانعامکم تک پڑھیں۔ اس کے بعد فرمایا کہ ان آیات کریمہ میں جن جن چیزوں کا بیان فرمایا گیا ہے ان سب کو ہم پہچان گئے لیکن اَبًّا کیا چیز ہے؟ (معلوم نہ ہوسکا) پھر عصا جو آپ کے ہاتھ میں تھا اس کو پٹک کر فرمایا خدا کی قسم!

یہ تکلف ہے اے عمر! اگر ایک لفظ اَبّاً کے معنی تجھے معلوم نہ ہوں تو تجھ پر کوئی بڑی ذمہ داری نہیں۔ (پھر لوگوں سے مخاطب ہو کر فرمایا) کتاب اللہ کا اتباع ضروری ہے اس کی جو ہدایت واضح ہو اس پر عمل کئے جاؤ۔ اور جس کو تم پہچان نہ سکو اس کو اپنے رب کے تفویض کردو۔" امام بخاریؒ نے بھی اس روایت کے قریب قریب اس واقعہ کو نقل فرمایا ہے۔ حضرت عمرؓ سے لوگوں نے اَبّاً کے معنی دریافت کئے تو آپ نے کبھی فرمایا:۔ مه نهينا عن هذا التكلف۔ چھوڑو ہم کو ایسے تکلف سے منع فرمادیا گیا ہے" اور کبھی فرمایا:۔ ما كلفنا هذا وما امرنا بهذا۔ ہم کو ایک ایک کلمہ کے جاننے کی) تکلیف نہیں دی گئی اور نہ ہم کو ایسا حکم دیا گیا۔"

ایک شبہہ کا ازالہ اس تقریر سے بظاہر یہ دکھائی دیتا ہے کہ معانی قرآن کی دریافت اور تلاش اور مشکلات قرآن کریم کی تحقیق سے منع کرنا حضرت عمرؓ کا مقصد تھا؟ اس کے متعلق زمخشری لکھتے ہیں:۔ لم يذهب الى ذلك ولكن القوم كانت اكبر همتهم عاكفة على العمل وكان التشاغل بشئ من العلم لا يعمل به تكلفا فاراد رضى الله تعالىٰ عنه ان الآية مسوقة فى الامتنان على الانسان بمطعمه واستدعاء شكره وقد علم من فحواها ان الاَبّ بعض ما ابنت سبحانه للانسان متاعا له او للانعام فعليك بما هو اهم

من الخوض بالشکر له عزوجل علی ما تبین لك ولم یشکل مما عدّد من نعمته تعالی ولا تتشاغل عنه بطلب معنی الاب ومعرفة النبات الخاص الذی هو اسم له واکتف بالمعرفة الجملیة الی ان یتبین لك فی غیر هذا الوقت ثم وصّی الناس بان یجروا علی هذا السنن فیما اشبه ذلك من مشکلات القرآن ۔ حضرت عمرؓ کا منشا تحقیق سے روکنے کا نہ تھا۔ بلکہ جماعت صحابہ کی تمام تر کوشش، عمل پر مرکوز تھی۔ کسی ایسی چیز کی تحقیق، جس کا عمل سے تعلق نہ ہو اس کو وہ تکلف خیال کرتے تھے۔ حضرت فاروق اعظمؓ نے یہ بتا دینا چاہا کہ اس آیہ کریمہ کے ذریعہ ان احسانات کو جتایا جارہا ہے جو انسان کی غذا کے سلسلہ میں اس پر فرمائے گئے اور ان کے شکر گزار رہنے کا مطالبہ کیا جارہا ہے اور فحوائے کلام سے صاف طور پر یہ معلوم ہو رہا ہے کہ اَبًّا سے کوئی ایسی چیز مراد ہے جس کو اللہ سبحانہ نے انسان یا اس کے جانوروں کے فائدے کے لئے اگائی ہے لہذا اس کی شکر گزاری میں لگے رہو یہی اہم ہے۔ رہا یہ کہ اَبًّا کے معنی کیا ہیں اور اس سے کونسی خاص چیز مراد ہے اس کا نہ جاننا شکر گزاری میں حارج نہیں ہے اتنا تو معلوم ہو رہا ہے کہ اَبًّا نباتات کی قسم سے ہے اور اس میں ہمارے یا ہمارے جانوروں کے لئے کار آمد ہے پس ادائے شکر کے لئے اس قدر اجمالی علم کافی ہے۔ اس کلمہ کے خصوصی معنی کسی اور وقت پر دریافت ہو جائیںگے۔ پھر لوگوں کو آپ نے یہ تاکید کی کہ

قرآن کریم میں اگر کسی دوسری جگہ اسی طرح کی کوئی شکل درپیش ہو تو اشکال دفع ہونے تک عمل کو نہ چھوڑ بیٹھیں بلکہ اجمالی علم کو کافی جان کر اس پر عمل پیرا رہیں تفصیلی علم بعد کو ہو جائیگا ۔"

فقیر عرض کرتا ہے اللہ سبحانہ کا وعدہ ہے :۔ اتقوا اللہ ویعلمکم اللہ ۔ اللہ سے ڈرتے رہو اور اس کے حکم کے مطابق عمل کئے جاؤ تو اللہ سبحانہ تم کو علم سے بہرہ ور فرما دیگا ۔" چنانچہ حضرت ابن عباسؓ اور دیگر ائمہ تفسیر سے بعد کو ابّا کے حقیقی معنی معلوم ہو چکے کہ اس سے گھانس چارہ مراد ہے ۔ واللہ اعلم ۔

فَاِذَا جَآءَتِ الصَّآخَّةُ ۝ؔعہ يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيهِ ۝ لا

عہ الصاخۃ شدۃ صوت ذی المنطق یقال صخ یصخ صخا صاخ قال فاذا جاءت الصاخۃ وھی عبارۃ عن القیامۃ حسب المشار الیہ بقولہ یوم ینفخ فی الصور وقد قلب عنہ اصاخ یصیخ ۔ (مفردات) کلام کرنے والے کی سخت آواز کو صاخہ کہتے ہیں اسکا ماضی صخ اور مضارع یصخ اور مصدر صخ اور اسم فاعل صاخ مستعمل ہے ۔ ارشاد باری ہے :۔ فاذا جاءت الصاخۃ ۔ جب سخت دھماکو آواز آئے ۔" اس سے قیامت مراد ہے جیساکہ ارشاد باری تعالیٰ یوم ینفخ فی الصور میں اس طرف اشارہ

۳۷-۳۴ (۳۰-۸۰)

وَاُمِّهٖ وَاَبِيْهِ ۝ وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِيْهِ ۝ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَاْنٌ يُّغْنِيْهِ ۝ پھر جب آئے وہ کان پھاڑنے والی (آواز) جس دن بھاگتا ہوگا ایک ایک شخص اپنے ہی بھائی سے اور اپنی ماں اور باپ سے، اور اپنی ساتھ والی (بی بی) اور اپنے ہی بیٹوں سے ہر شخص کا ان میں سے ایک (عجیب پریشان) حال ہوگا جو اس کو ان سب سے بے نیاز کر دیگا۔

فاذا جاءت الصاخۃ کا ربط یہاں مفسرین کرام کے دو قول ہیں۔ ایک یہ کہ ان آیات کریمہ کا ربط و تعلق آیت سابقہ انھا تذکرۃ سے ہے یعنی یہ قرآن کریم نصیحتوں سے بھری ہوئی کتاب ہے۔ جو کوئی اس کی نصیحتوں سے فائدہ اٹھانا چاہے اس کے لئے موقع ہے کہ اس کو پڑھے سنے سمجھے اور اس پر عمل کرے۔ واعظ اور متعظ یعنی وعظ سنانے والا اور وعظ سننے والا دونوں ایک جگہ جمع ہوکر بیٹھ سکتے اور کار نصیحت کو جاری رکھ سکتے ہیں۔ پھر جب صور کی دھماکو آواز شروع ہوگی تو مل بیٹھنے کا موقع باقی نہیں رہیگا۔ چل کوچ کی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

فرمایا گیا ہے۔ (یعنی جس دن صور پھونکا جائیگا) اور اس میں قلب کرکے اصاخ یصیخ باب افعال کے صیغے) بنائے گئے ہیں۔"

ٹھہرے گی۔ انسان ایک دوسرے سے گریزاں ہوگا اوروں کا تو کیا ذکر، خود اپنے ساتھ کے بھائی، بلکہ اپنے ماں باپ، اور بی بی بچوں سے بھاگتا ہوگا اور کوئی کسی کا خبرگیراں نہ ہوگا۔

قول ثانی دوسرا قول یہ ہے کہ ان آیات کریمہ کا ربط، ارشاد باری تعالیٰ قتل الانسان ما اکفرہ سے ہے۔ اس اعتبار سے معنی یوں ہوں گے کہ مارا جائے انسان کہ وہ کیا ہی ناشکرہ ہے۔ اس کی عاقبت کو سدھارنے کے لئے یہ کتاب اتاری گئی ہے مگر انسان کا یہ حال ہے کہ ایسی مبارک کتاب کو چھوڑ کر وہ اپنی برادری، ماں باپ، اور بی بی بچوں سے دل لگاتا ہے۔ وہ یاد رکھے کہ ایک دن اس پر ایسا بھی آنے والا ہے کہ ایک دھماکو آواز ہوگی۔ اس کے آتے ہی یہ سارے تعلقات ٹوٹ جائیں گے اور انسان اپنے ہم جنسوں، اور اپنے ہی عزیز قریب رشتہ داروں کی صورت سے بیزار ہوکر ان سے راہ فرار اختیار کرے گا حتیٰ کہ اگر اس کے پاس اس کا بھائی بھی آئے یا ماں باپ ہی نظر آجائیں یا بی بی بچے لپٹتے ہوں تو وہ ان سب سے بھاگ کر ادھر ادھر بھٹکتا پھریگا۔ اور کسی حال اس کو چین نصیب نہ ہوگا۔ اس لئے کہ وہ خود اپنی فکر میں چور ہے۔ پھر دوسروں کی خبرگیری وہ کیا کرسکتا ہے۔ بلکہ اس کو ڈر ہے کہ انکی وجہ سے

کوئی نئی آفت اس پر نہ آجائے۔

کیفیت بعث ام المومنین حضرت سودہ بنت زمعہؓ فرماتی ہیں کہ معدن الجود والکرم حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: یبعث الناس حفاۃً عراۃً غرلاً قد الجمہم العرق وبلغ شحوم الاذان قلت یا رسول اللہ واسوأتاہ ینظر بعضنا الی بعض قال شغل الناس عن ذالک وتلا یوم یفر المرء الی شان یغنیہ۔ (طبرانی، حاکم بروایت صحیحہ ابن مردویہ بیہقی) لوگ برہنہ پا، برہنہ تن، بغیر ختنہ کئے ہوئے اٹھائے جائینگے (جیسے کہ پیدا ہوئے تھے) پسینہ ان کے منہ اور کان کی لو تک پہنچا ہوا ہوگا۔ یہ سنتے ہی میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! ہائے بے ستری! کیا (اس برہنگی کی حالت میں) ہم میں کا ایک ایک دوسرے کو دیکھتا رہیگا؟ آپ نے فرمایا کہ اس طرف خیال ہی کسی کو کب آتا ہوگا؟ (اس وقت تو بڑی پریشانی اور سراسیمگی ہر طرف چھائی ہوئی ہوگی) پھر آپ نے یہ آیات کریمہ یوم یفر المرء سے شان یغنیہ تک تلاوت فرمائیں۔ امہات المومنین حضرت عائشہؓ اور حضرت ام سلمہؓ سے بھی اسی طرح مروی ہے [عہ ۱]

عہ ۱ بڑی آفت میں چھوٹی باتیں فراموش ہو جاتی ہیں | اکثر دیکھا گیا ہے کہ دو فریق جنکی عمر

اعزہ اقرباء سے پہلے بھاگنے والے	حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا: ان اول من یفر یوم القیامۃ من ابیہ ابراھیم واول من یفر من امہ ابراھیم

واول من یفر من اخیہ ھابیلؑ واول من یفر من صاحبتہ نوح ولوط

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

ایک دوسرے کے خلاف مقدمہ بازی میں گزرتی رہی جب کوئی عام پریشانی اور سراسیمگی پھیل جاتی ہے تو وہ باہمی مخالفت کو بھول جاتے اور سب کے سب مل کر اس پریشانی کو دفع کرنے کی فکر میں لگ جاتے ہیں۔ انسان تو انسان جانور بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ حیدرآباد میں رودموسی کو طغیانی ہوئی تو بعض لوگ درختوں پر چڑھ گئے۔ دیکھا کہ درخت پر ان سے پہلے سانپ وغیرہ موذی جانور بھی چڑھ آئے ہیں۔ انسان جس طرح سیلاب سے پریشان تھے سانپ بھی سراسیمگی کے عالم میں اپنی جان بچانے کی دھن میں تھے۔ نہ آدمیوں نے سانپوں سے تعرض کیا اور نہ سانپوں نے ان آدمیوں کو چھیڑا اسلئے کہ ہر دو فریق اپنی اپنی فکر میں غرق تھے۔ حضرت عطار رحمۃ اللہ علیہ نے طوفان نوح کا ایک نقشہ اس طرح کھینچا ہے۔

کشتئ آورد در دریا شکست | تختۂ زاں جملہ بر بالا نشست
گربہ و موشے دراں تختہ بماند | کار شاں با یک دگر یکجہ بماند
نہ ز گربہ موش را روئے گریز | نہ بموش آں گربہ را چنگال تیز
ہر دو شاں از ہول دریائے عجب | در تحیر باز ماندہ خشک لب
در قیامت نیز ایں غوغا بود | یعنی آں جانے تو وتے ما بود

یعنی حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی جب پانی میں رواں ہوئی تو اس کا ایک تختہ توڑ دیا گیا نتیجہ یہ ہوا کہ چوہا اور بلی دونوں یک تختہ پر آرہے۔ نہ چوہے کیلئے جائے گریز رہی اور نہ بلی اس پر اپنے دانت تیز کرسکی یہ طوفان کچھ ایسا شدید تھا کہ دریا میں رہ کر بھی چوہا اور بلی پیاسے تھے۔ اسی طرح ہنگامۂ محشر بھی سمجھ لیا جائے کہ جب قیامت ہوگی تو من و تو کے سارے جھگڑے ایک طرف رہ جائینگے اور ہر کوئی نفسی نفسی کی فکر میں ڈوبا ہوا ہوگا۔ اللھم احفظنا آمین۔

وتلا هذہ الآیۃ ...... فیرون ان هذہ الآیۃ نزلت فیھم (ابن عساکر)

قیامت کے دن سب سے پہلے جو اپنے باپ سے بھاگیں گے وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ہونگے اور سب سے پہلے جو اپنی ماں سے بھاگیں گے وہ بھی حضرت ابراہیم ہی ہوں گے اور اپنے بھائی سے بھاگنے والوں میں سب سے پہلے حضرت ہابیل ابن آدم علیہما السلام ہوں گے۔ اور سب سے پہلے جو اپنی بی بی سے بھاگ جائیں گے وہ حضرت نوح اور حضرت لوط علیہما السلام ہوں گے۔ اس کے استشہاد میں آپ نے یہ آیات تلاوت فرمائیں۔ اس بنا پر مفسرین کرام خیال فرماتے ہیں گویا یہ آیات کریمہ ان ہی حضرات کی شان میں نازل ہوئیں۔"

عرض فقیر فقیر عرض کرتا ہے کہ اس بنا پر یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ قیامت کے دن سب سے پہلے جو اپنے بیٹوں سے بھاگیں گے وہ حضرت نوحؑ ہونگے جو اپنے فرزند کنعان سے بھاگیں گے۔"

ایک نکتہ یہاں یہ نکتہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ازواج مطہرات کی شان میں اللہ سبحانہ نے فرمایا:۔ وازوجہٗ امھاتھم۔ "آپ کی بی بیاں ایمان والوں کی مائیں ہیں"۔ اسی بنا پر آپ کی ازواج مطہرات کو امہات المومنین کے مبارک لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ بایں ہمہ حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان مبارک میں ارشاد ہوا:۔ ما کان محمد ابا احد من رجالکم

محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تمھارے بالغ مردوں میں سے کسی کے باپ نہ ہوئے"۔ گو آپ کی صاحبزادیاں تھیں، اور صاحبزادے بھی ہوئے مگر وہ طفولیت ہی میں رفیق اعلیٰ سے جاملے۔ سن بلوغ کو پہنچنے نہ پائے کہ ان پر رجال کا اطلاق ہو سکے۔ اس میں اس امر کی طرف ایما، موجود ہے کہ اگر آپ حضور اکرمؐ کو اہل ایمان کا باپ قرار دیا جاتا تو قیامت میں یوم یفر المرء کی آیات کے مطابق خیال ہوتا کہ آپ اپنی امۃ مرحومہ سے بھاگ جائیں گے۔ اور یہ صورت آپ کی شان شفاعت کبریٰ کے منافی ہوتی اس لئے ازدواج مطہرات کو امہات المومنین قرار دینے کے باوصف، حضور کی ابوت کی نفی فرمائی گئی۔ واللہ اعلم۔

بہرحال روز قیامت کی ہولناکی ان آیات کریمہ سے ظاہر ہے کہ بھائی بھائی سے، باپ بیٹے سے، ماں بھی اپنے بیٹے سے، میاں اپنی بی بی سے اس دن گریزاں ہوگا کوئی کسی کے کام نہ آئیگا۔ ہر شخص کو نفسی نفسی کی فکر لگی ہوگی صرف حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات گرامی ہی وہ واحد ہستی مبارک ہوگی کہ آپ امتی امتی فرماتے ہوں گے۔ فداہ آباؤنا وامہاتنا واخواننا واولادنا وانفسنا۔ آمین۔

وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ ۝ ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ ۝ وَوُجُوْهٌ

يَّوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ ۝ تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ ۝ أُولٰٓئِكَ هُمُ الْكَفَرَةُ

الْغَبَرَۃٌ کتنے چہرے اس دن روشن ہوں گے، ہنستے خوشیاں مناتے اور کتنے رکوع ۵
چہرے ہوں گے اس دن غبار آلود، چڑھی آتی ہے ان پر سیاہی، یہ (روسیاہ)
وہی ہیں کافر بدکار۔"

اہل محشر کے چہرے دنیا میں مومن و کافر اور نیک و بد ایک ساتھ زندگی گزار رہے ہیں۔ اس سے یہ خیال نہ کیا جائے کہ عالم آخرت میں بھی ایسا ہی ہوگا۔ نہیں نہیں۔ دنیا دارالعمل ہے۔ امتحان و آزمائش کی جگہ ہے۔ امتحان میں سبھی شریک ہیں نیز امتحان گاہ میں شوقین اور بدشوق سبھی جمع ہیں لیکن آخرت دارالجزاء ہے وہاں امتحان کے نتائج برآمد ہوں گے اور نتیجہ کے مطابق ہر ایک کو اپنی اپنی جزا ملیگی۔ کامیاب جماعت کا مقام جداگانہ ہوگا اور ناکام جدا مقام پر ٹھہرائے جائیں گے۔ پھر کامیابوں کے بھی مدارج ہوں گے۔ اعلیٰ، اوسط، ادنیٰ ہر ایک کے ساتھ جداگانہ سلوک ہوگا۔ جن کی کامیابی کا اعلان ہوگا، ان کے چہرے فرط خوشی سے ظاہر ہے کہ روشن اور چمکتے ہونگے کیونکہ جب کسی کا جی خوش ہو جاتا ہے تو اس کی رگوں میں خون دوڑنے لگتا ہے جیسا کہ درختوں کو جب پانی دیا جاتا ہے تو وہ ہرے بھرے سرسبز و شاداب نظر آتے ہیں۔ کمال مسرت سے ان کی باچھیں کھل جائینگی وہ ہنستے اور خوش و خرم دکھائی دینگے۔ پھر ایک دوسرے سے کامیابی کی بشارت اور مبارکباد سن کر باغ باغ ہوتے جائینگے۔

مُسفِرَۃٌ کی تفسیر مُسفِرَۃٌ مشتق ہے اِسفار سے ۔ محاورۂ عرب ہے اسفر الصبح صبح کی روشنی نمودار ہوئی ۔ اچھا اُجالا ہوگیا ۔ علامہ راغب لکھتے ہیں : ۔ الاسفار مختص باللون ۔ لفظ اسفار رنگ کے ساتھ خاص ہے " اس اعتبار سے مسفرۃ کے معنی ہوئے کہ ان کا رنگ چمکتا درخشاں ہوگا ۔

چہرے کی درخشانی تہجد گزاری کی نشانی فقیر عرض کرتا ہے کہ قیامت میں چہرے کی درخشانی نتیجہ ہے بعض اعمال صالحہ کا جو اہل ایمان دنیا میں کرتے تھے ۔

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں : ۔ ان ذلك من قیام اللیل ان اہل ایمان کے چہروں کی یہ درخشانی ان کی شب بیداری اور تہجد گزاری کا ثمرہ ہے " اس کی تائید اس حدیث شریف سے ہوتی ہے جس میں حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا : ۔ من کثرت صلا تہ باللیل حسن وجھہ بالنھار ۔ رات میں جس کی نمازیں زیادہ ہوں تو دن کو اس کا چہرہ نورانی رہیگا " جب صلاۃ اللیل کی کثرت کا دنیا میں یہ حال ہو تو ظاہر ہے کہ قیامت میں جو وہ بھی پچاس ہزار برس کے برابر ایک دن ہے اس کا چہرہ درخشاں رہیگا ۔

چہرے کی درخشانی وضو کی بدولت حضرت ضحاکؒ فرماتے ہیں : ۔ من آثار الوضوء اہل ایمان کے چہروں کی یہ درخشانی آثار وضو کی بنا پر ہوگی "

اس کی تائید بھی احادیث شریفہ سے ہوتی ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ حضرت شفیع الامم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا: ۔ ان امتی یدعون یوم القیامۃ غرّا محجلین من آثار الوضوء فمن استطاع منکم ان یطیل غرّتہ فلیفعل (صحیحین) میری امت قیامت کے دن غرّ محجّلین کے لقب سے یاد کی جائیگی یا وہ ایسی حالت میں اٹھائے جائیں گے کہ ان کے ہاتھ پاؤں اور چہرے وضو کے اثرات سے روشن ہوں گے۔ لہٰذا تم میں جس سے ہو سکے کہ اپنی روشنی کو بڑھائے تو ان کو ایسا کرنا چاہیے "۔ اس سے اچھی طرح پورا وضو احتیاط کے ساتھ بنانا مراد ہے۔ بعض صحابہ کرامؓ اپنے ہاتھ کہنیوں سے اوپر اور پاؤں ٹخنوں سے اوپر اور چہرہ اس کے حدود سے کچھ زیادہ دھولیا کرتے تھے تاکہ روشنی میں اضافہ ہو۔ حدیث شریف میں یہ بھی آیا ہے: تبلغ حلیۃ المومن حیث یبلغ الوضوء۔ (مسلم عن ابی ہریرہؓ) مومن کی آراستگی اور زینت کی رسائی وہاں تک ہوگی جہاں تک اس کے وضو کا سلسلہ پہنچتا ہوگا" اس سے بھی صحابہ کرامؓ کے مذکورہ عمل کی تائید ہوتی ہے۔ یہاں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ وضو اس امۃ مرحومہ کا مخصوص عمل ہے لہٰذا وضو کی بدولت چہرے کی یہ درخشانی امۃ مرحومہ کی مختصہ فضیلت ہے۔ امم سابقہ میں وضو نہ تھا۔

چہرے کی درخشانی راہ خدا میں غبار آلود ہونے سے	ایک قول یہ ہے: من طول ما اغبرّت

فی سبیل اللہ۔ مومنین کے چہروں کی یہ چمک دمک راہ خدا میں ان کے غبار آلود
ہونے کے صلہ میں ہے" یعنی جہاد فی سبیل اللہ۔ یا حج کی ادائی یا طلب علم کے لئے جو
سفر اختیار کیا جائے یا نماز جمعہ وعیدین وغیرہ کے لئے طے مسافت میں چہرہ غبار آلود
ہوتا رہے تو اس کی برکت سے قیامت میں ان کے چہرے درخشاں ہونگے۔ حدیث شریف
میں یہ بھی آیا ہے:۔ بشّر المشائین الی المساجد فی ظلم اللیالی بالنور التامّ
یوم القیامۃ۔ جو لوگ اندھیری راتوں میں مسجدوں کو جاتے آتے ہیں انکو خوشخبری
سنا دو کہ قیامت کے دن ان کو پورا پورا نور حاصل ہوگا" بہر حال یہ چند اعمال صالحہ
ہیں جو بطور تمثیل و نمونہ پیش کئے گئے جن کی پابندی سے قیامت میں چہرے نورانی
رہیں گے۔ اہل ایمان کو چاہیئے کہ ان میں سے کم از کم کسی ایک کے پابند رہیں۔
یہ کوئی مشکل کام نہیں۔ اپنے شوق و رغبت کے لحاظ سے کسی ایک کام کے پابند رہکر
یہ دولت بے بہا حاصل کی جا سکتی ہے۔

ضاحکۃ مستبشرۃ کی تفسیر ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ۔ ہنستے، خوشیاں مناتے
ہونگے" یعنی اہل ایمان اپنی کامیابی کی بشارت سنتے ہی (جہاں ان کے چہرے
چمک اٹھیں گے) خوش وخرم ہو کر کمال شادمانی سے ہنستے ہوئے دکھائی دیں گے
پھر کامیاب جماعت کے اصحاب میں باہم بشارت کے پیامات کا تبادلہ ہوتا رہیگا۔

یہ ان کو بشارت و مبارک باد دیں گے اور وہ ان کو بشارت و مبارکباد سناتے جائینگے۔ جیساکہ ایسے مواقع پر عملدرآمد ہے۔ اور یہ ایک فطری امر ہے۔ پھر یہ بشارت اور مسرت جس درجہ کی ہوتی ہے اس کی مناسبت سے خوشی اور شادمانی کا اظہار ہوتا ہے آخرت کی کامیابی چونکہ مدۃ العمر کے کاموں کا نتیجہ ہے اسلئے اس کا سلسلہ بھی نامتناہی ہوگا۔ صالحین کے لئے جو نعمتیں اور جو جو سامان مسرت وہاں مہیا ہے وہ دوامی طور پر نئی نئی صورتوں میں جلوہ گر ہوتا رہیگا۔ اور وہ اس سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے لطف اندوز ہو کر شکر گزار رہیں گے۔ پھر رویت باری تعالیٰ ایسی نعمت عظمیٰ ہوگی جس کا لطف کبھی ختم نہ ہوگا۔ اللھم اجعلنا منھم۔ آمین۔

وَ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ۔ اور کتنے چہرے اس دن غبار آلود ہوں گے جن پر سیاہی چڑھ آتی ہوگی۔"

علیھا غبرۃ کی تفسیر حضرت سیدنا امام جعفر صادقؑ اپنے والد ماجد حضرت سیدنا امام محمد باقرؑ سے، اور آپ اپنے والد ماجد حضرت سیدنا امام زین العابدین سے اور آپ اپنے والد ماجد حضور سیدنا امام حسینؑ علی جدہم وعلیہم الصلوٰۃ والتسلیم سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت سید الکونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: یلجم الکافر العرق ثم تقع الغبرۃ علی وجوھھم فھو قولہ ووجوہ یومئذ علیھا غبرۃ۔ (ابن ابی حاتم)۔

کافروں پر پسینہ چھا جائیگا پھر ان کے چہروں پر غبار پڑیگا۔ ارشاد باری تعالی ووجوہ یومئذ علیہا غبرۃ کی یہ تفسیر ہے" پسینے سے چہرہ تر بتر ہونے کے بعد جب اس پر غبار پڑیگا تو غبار خوب جم جائیگا اور چہرہ بدنما ہو جائیگا۔

ترھقہا قترۃ کی تفسیر ترھقہا قترۃ کی تفسیر میں حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں تغشاھا شدۃ وذلۃ۔ (ابن ابی حاتم، ابن المنذر) ان کے چہروں پر کمال درجہ کی شدت اور ذلت چھائی ہوئی ہوگی" دیگر مفسرین کرام نے قَتَرَۃٌ سے سیاہی مراد لی ہے جو کافر پر چھا جائیگی جو کسی مقصد میں ناکام رہ جانیکی صورت میں دکھائی دیتی ہے۔ کسی نے دھواں مراد لیا ہے اور حضرت سری السقطی قدس سرہ فرماتے ہیں:۔ ظاھر علیہا حزن البعاد لانھا صارت محجوبۃ من الباب مطرودۃ۔ ان کے چہروں پر رحمت الٰہی سے دوری کا غم غالب آ گیا ہوگا کیونکہ وہ وصال الٰہی سے محجوب اور بساط محبت میں آنے سے ممنوع ومطرود ہو چکے ہیں" اور حضرت سہل بن عبداللہ تستری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:۔ غلب علیہا اعراض اللہ عنہا ومقتہ ایاھا فھی تزداد فی کل وقت ظلمۃ وقترۃ۔ اللہ سبحانہ کے اعراض اور اس کی ناراضی وغضب کا ان پر غلبہ ہو گیا ہے جس کے باعث ان کی تاریکی اور سیاہی آناً فآناً بڑھتی ہی جاتی ہے"

عرض فقیر فقیر عرض کرتا ہے کہ نتیجہ ان تمام تفاسیر کا ایک ہی ہے کہ جن لوگوں نے قیامت اور جزا پر یقین نہ کیا اور خدا اور رسولؐ کی تعلیمات پر توجہ نہ دی۔ قیامت کے دن ان کو حسرت ہوگی اور کمال حسرت سے ان کے چہرے اداس ہوں گے۔ اور ان پر ہوائیاں چھوٹتی رہینگی

الکفرۃ الفجرۃ کی تفسیر اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ ۔ وہ (روسیاہ) وہی منکر ہیں بدکاری میں ڈوبے ہوئے۔" یعنی فجور اور کفر یہ دونوں مذموم صفات جہاں جمع ہوں قیامت میں ان کا وہی حال ہوگا جو اوپر بیان فرمایا گیا۔ فجور کے اصل معنی کذب اور میل عن الحق کے ہیں یعنی جھوٹ پر قائم رہنا اور حق سے اعراض کرنا۔ خواہ قولاً ہو یا فعلاً یا اعتقاداً۔ فجور جب اپنی انتہا کو پہنچ جاتا ہے اور قول و فعل اور اعتقاد سب پر چھا جاتا ہے تو وہ کفر کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ جیسا کہ صغیرہ گناہ پر کسی کا اصرار جاری رہتا ہے تو وہ کبیرہ بن جاتا ہے اور کبائر جب اپنی انتہا کو پہنچ جاتے ہیں تو نوبت کفر کی آجاتی ہے۔ کیونکہ گناہ کی مذمت دل سے نکل جاتی ہے اور اس کو خفیف اور ہلکا سمجھا جاتا ہے۔ جب اس کی برائی اور حرمت ذہن سے فراموش ہو جاتی ہے تو استحلال معصیت کی نوبت آتی ہے کیونکہ گناہ کو جائز اور حلال تصور کرنا شرعاً کفر ہے۔ نعوذ باللہ منہ ہاں جہاں فجور اس درجہ پر نہ پہنچا ہو یعنی کفر اس کے ساتھ جمع نہ ہوا ہو تو ان کا وہ حشر نہ ہوگا جو اوپر بیان ہوا۔ مگر چاہیے کہ جہاں تک ہو سکے بدکاری سے دوری اختیار

کی جائے کہ یہیں سے انسان صراط مستقیم سے ہٹتا جاتا ہے۔ دوری اختیار کرنے کا طریقہ توبہ و استغفار ہے۔ اگر کسی سے احیاناً کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو فوراً توبہ و انابت سے کام لے۔ ارشاد باری ہے:۔ والذین اذا مسّھم طائف من الشیطان تذکروا فاذا ھم مبصرون۔ مومنین کی صفت یہ ہے کہ جب ان کو شیطانی خیال کبھی چھو لیتا ہے تو وہ فوراً اللہ سبحانہ کی یاد کرتے اور آئندہ کے لئے بصیرت ایمان سے کام لینے لگتے ہیں۔

دعاو خاتمہ اللہ سبحانہ ہم کو اور تمام مسلمان بھائیوں کو نیک توفیق عطا فرمائے اور صراط مستقیم پر چلائے کہ یہی صورت فلاح و کامیابی کی ہے۔ آمین ثم آمین۔ بجاہ سید المرسلین صلوات اللہ وسلامہ علیہ وعلیہم وعلی آلہ واصحابہ اجمعین۔

سورہ عبس کی تفسیر ختم ہوئی۔ وللہ الحمد والمنہ۔ ۱۶ رشعبان المعظم ۱۳۷۹ھ